ماہنامہ

انذار

Inzaar

مدیر: ابو یحییٰ

نومبر ۲۰۱۸

www.inzaar.pk

November 2018

دنیا کی محرومی اس شخص کے لیے عظیم نعمت ہے
جو اس کے آئینے میں آخرت کی محرومی کا عکس دیکھ کر
خود کو اس ابدی محرومی سے بچانے کا عزم کرلے

ابویحیٰ کا نیا چوتھا ناول شائع ہو گیا ہے

''خدا بول رہا ہے''

عظمتِ قرآن کا بیان ایک دلچسپ داستان کی شکل میں

''جس طرح کسی انسان کو اپنی کوئی اولاد بری نہیں لگتی البتہ بعض بچے دوسروں سے زیادہ پیارے ہوتے ہیں، اسی طرح ایک مصنف کو اپنی بعض تصنیفات زیادہ عزیز ہوتی ہیں۔ یہ قاعدہ اگر ٹھیک ہے تو ''خدا بول رہا ہے'' کی صورت میں اس دفعہ قارئین کی خدمت میں ایک ایسا ناول پیش ہے جس کے متعلق اس خاکسار کا خیال ہے کہ یہ اپنے پیغام کے لحاظ سے بہت موثر اور کہانی کے اعتبار سے بہت دلچسپ ہے۔ یہ اس مصنف ہی کا نہیں بلکہ ان تمام لوگوں کا بھی خیال ہے جن کی خدمت میں اسے ابتدائی فیڈ بیک یا اسکریننگ کے لیے پیش کیا گیا تھا۔ اس لیے امید ہے کہ قارئین اس ناول کو پچھلے ناولوں سے زیادہ مفید اور دلچسپ پائیں گے۔''

ابویحیٰ

ماہنامہ

اِنذار

نومبر 2018ء صفر/ربیع الاول 1440ھ

جلد 6 شمارہ 11

مدیر:
ابو یحییٰ ریحان احمد یوسفی

سرکولیشن مینیجر:
غازی عالمگیر

معاون مدیر:
عابد علی، بنت فاطمہ، سحر شاہ

معاونین:
محمد شفیق، محمود مرزا

ابو یحییٰ کے قلم سے

فی شمارہ ــــ 25 روپے
سالانہ: کراچی (بذریعہ کوریئر) 500 روپے
بیرون کراچی (نارمل پوسٹ) 400 روپے
(زرتعاون بذریعہ منی آرڈر یا ڈرافٹ)
بیرون ملک 2500 روپے
(زرتعاون بذریعہ پوسٹل بیرئر آرڈر یا ڈرافٹ)
نارتھ امریکہ: فی شمارہ 2 ڈالر
سالانہ 24 ڈالر

P.O Box-7285, Karachi.
فون: 0332-3051201, 0345-8206011
ای میل: globalinzaar@gmail.com
web: www.inzaar.org

مسولینی

دوسری جنگ عظیم انسانی تاریخ کی سب سے زیادہ تباہ کن جنگ تھی جس میں کروڑوں لوگ مارے گئے۔ اس جنگ کے پھیلنے کی بنیادی وجہ ہٹلر کا ایک ایک کر کے یورپ کے کئی مما لک پر قبضہ کرنا تھا۔ اس جنگ میں ہٹلر کے ساتھ جاپان اور اٹلی بھی تھے اور ان کے اتحاد کو محوری (Axis) قوتوں کا اتحاد کہا گیا۔ اس اتحاد کو آخر کار جنگ میں شکست ہوگئی اور اتحادی (Allied) قوتیں یہ جنگ جیت گئیں۔

اس زمانے میں اٹلی میں ہٹلر کا قریبی اتحادی مسولینی حکمران تھا۔ مسولینی کا مقصد رومن ایمپائر کا احیا اور اٹلی کی عظمت کی بحالی تھی۔ وہ ایک اعلیٰ پائے کا مقرر اور مصنف تھا۔ اس نے اٹلی کی پوری قوم کو ایک قوم پرستانہ جنون سے بھر دیا۔ وہ لوگوں میں اتنا مقبول تھا کہ اس نے فاشزم کے جبر کو پوری قوم پر مسلط کر دیا اور قوم نے خوشی خوشی یہ جبر اس لیے قبول کیا کہ اس کے ذریعے سے وہ رومی سلطنت کی عظمت رفتہ کو پالیں گے۔

تاہم اٹلی باقی یورپی اقوام کے مقابلے میں بہت کمزور ملک تھا۔ چنانچہ جب عملی طور پر اٹلی جنگ عظیم میں اترا تو اسے برطانیہ کے ہاتھوں پے در پے شکستوں کا سامنا کرنا پڑا۔ ہٹلر مشکل میں اٹلی کو بچانے آیا مگر اٹلی کی کمزوری کی بنا پر آخر کار جرمنی کو بھی اس محاذ پر شکست ہوگئی۔ افریقہ کے اپنے مقبوضات میں شکست کے ساتھ خود اٹلی پر اتحادیوں کا قبضہ ہو گیا اور مسولینی کو قتل کر دیا گیا۔ اٹلی کی اس شکست سے خود جرمنی بھی بہت کمزور ہو گیا۔

اس دنیا میں جذباتی باتیں کر کے لوگوں کے جذبات کو بھڑکانا بہت آسان کام ہے۔ مگر عملی طور پر اپنی کمزوریوں کو دور کیے بغیر میدان میں اترنے والے لوگوں کا انجام مسولینی جیسا ہوتا ہے۔ یہ لوگ عظمت رفتہ کے خواب دکھاتے ہیں مگر عملی طور پر موجودہ ملک پر بھی دشمنوں کا قبضہ کرا دیتے ہیں۔ ایسے لیڈر خود بھی ڈوبتے ہیں اور دوسروں کو بھی لے ڈوبتے ہیں۔

قادیانی مسئلہ، ختم نبوت اور مسلمان

پچھلے سو برسوں سے ہمارے ہاں قادیانی مسئلہ کسی نہ کسی حوالے سے زیر بحث رہتا ہے۔ اس کا ایک بڑا فائدہ یہ ہوا ہے کہ برے بھلے تمام مسلمان ختم نبوت کے تصور سے اچھی طرح واقف ہو چکے ہیں۔ مسلمان اب کسی صورت میں اس بات کو گوارا کرنے کے لیے تیار نہیں کہ ختم نبوت کے عقیدے پر کسی طور پر بھی کوئی ضرب لگائے۔

یہ صورتحال کا ایک پہلو ہے۔ صورتحال کا ایک دوسرا پہلو بھی ہے۔ وہ یہ ہے کہ ختم نبوت کو ماننے کا لازمی تقاضا یہ ماننا ہے کہ اب دعوت دین کا کام کرنے کے لیے انبیا علیھم السلام نہیں آئیں گے اور اب یہ کام مسلمانوں کو کرنا ہے۔ اس کے بعد ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ جس طرح ختم نبوت مسلمانوں کے لیے ایک انتہائی حساس اور نازک مسئلہ بن گیا ہے، اسی طرح دعوت دین کا کام بھی مسلمانوں کے لیے انتہائی حساس اور نازک مسئلہ بن جاتا۔

پوری دنیا تک اسلام کا پیغام پہنچانے کی فکر سے مسلمان ہلکان ہو جاتے۔ اس موضوع پر کانفرنسیں ہوتیں۔ ادارے قائم کیے جاتے۔ بہترین لوگ اپنی زندگیاں وقف کر دیتے۔ امت کے وسائل کا بڑا حصہ اس کام کے لیے وقف ہو جاتا۔ یہی ہر منبر و محراب کی صدا ہوتی۔ یہی ہر رسالے اور کتاب کا ایک اہم موضوع بن جاتا۔ مگر عجیب بات ہے کہ یہ پہلو نہ کہیں زیر بحث آتا ہے نہ اس حوالے سے کوئی حساسیت کہیں پائی جاتی ہے۔

یہ سب کچھ اس حقیقت کے باوجود ہو رہا ہے کہ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نبی کریم کے پیرو کاروں کو مخاطب کر کے یہ کہتے ہیں کہ ان کا کام دنیا پر حق کی شہادت دینا ہے۔ مگر مسلمانوں کی یہ موجودہ روش ہی یہ بتانے کے لیے کافی ہے کہ وہ جو کچھ کر رہے ہیں اللہ تعالیٰ کے لیے نہیں کر رہے، اپنے قومی تعصب میں کر رہے ہیں۔ اسلام کے نام لیواؤں کا یہ تعصب نہ دنیا میں ان کے کام آئے گا نہ آخرت میں۔ اس کے برعکس مسلمان اگر دعوت کا راستہ اختیار کر لیں گے تو دنیا و آخرت کی عزت ان کی منتظر ہے۔

مردوں کی تربیت

اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے اس خاکسار نے دنیا کے متعدد ممالک کا سفر کیا ہے۔ ان اسفار میں پاکستانی مرد وخواتین کی ایک ایسی خصوصیت سامنے آئی جو دنیا میں کم ہی پائی جاتی ہے۔ مگر عجیب بات یہ ہے کہ یہ خصوصیت مرد وخواتین دونوں میں متضاد طور پر پائی جاتی ہے۔

پاکستانی خواتین کی یہ بڑی خصوصیت ہے کہ دنیا کی تمام اقوام کے مقابلے میں ان کے لباس میں عریانی سب سے کم پائی جاتی ہے۔ حتیٰ کہ مسلم ممالک سے بھی ان کا کوئی موازنہ نہیں ہوسکتا۔ سعودی عرب اور ایران کو اس تقابل سے اس لیے نکال دینا چاہیے کہ وہاں یہ قانونی پابندی ہے کہ خواتین مکمل لباس پہنیں۔ چنانچہ رضا کارانہ طور پر مکمل لباس پہننے کی خصلت جس طرح پاکستانی خواتین میں پائی جاتی ہے دنیا میں کہیں نہیں پائی جاتی۔

ملائیشیا وغیرہ کی مسلم خواتین بھی عام طور پر مکمل لباس پہنتی ہیں، مگر وہاں غیر مسلم خواتین کی تعداد کافی زیادہ ہے۔ ان کا نیم عریاں لباس ماحول کا مجموعی تناظر بڑی حد تک بدل دیتا ہے۔ جبکہ پاکستان میں مسلم کے علاوہ غیر مسلم خواتین کا لباس بھی مکمل ستر پوش ہوتا ہے۔

اس کے بالکل برعکس دنیا بھر کے مردوں کے برخلاف پاکستانی مرد اپنی ان ستر پوش بہنوں کو اوپر سے نیچے تک دیکھنا اپنی ایک لازمی ذمہ داری سمجھتے ہیں۔ وہ اس تصور ہی سے واقف نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اس بات کو سختی سے منع کررکھا ہے کہ خواتین کے خدوخال اور جسمانی نشیب وفراز کا جائزہ لیا جائے یا ان کو گھور کر دیکھا جائے۔ خاتون چاہے برقع پوش ہی کیوں نہ ہو، مرد اپنی عادت کے مطابق اسے دیکھتے ضرور ہیں۔

یہ جو کچھ ہم نے بیان کیا ہے، محض اتفاق نہیں ہے۔ مردوں کی اس عادت کے پیچھے ایک پوری تربیت موجود ہے۔ وہ تربیت یہ ہے کہ عورت انسان نہیں ہے بلکہ جنسی حظ فراہم کرنے والی ایک شے

ہے۔قابل احترام عورت صرف اپنی ماں، بہن، بیٹی ہی ہوتی ہے۔یا وہ خواتین جو اپنے قریبی مردوں کی رشتے دار ہوں۔اس کے علاوہ ہر عورت مزہ حاصل کرنے کی ایک چیز ہے اور کچھ نہیں۔

اس تربیت کا دوسرا جز اس بے ہودہ حرکت کی یہ توجیہ ہے کہ عورتیں اگر گھور کر دیکھے جانے اور چھیڑے جانے کے اس عمل سے محفوظ رہنا چاہتی ہیں تو انھیں چاہیے کہ وہ اپنے گھروں میں بیٹھیں۔وہ اگر باہر نکلیں گی تو بہرحال انھیں اس صورتحال کا سامنا کرنا ہوگا۔چاہے وہ برقع پہنے ہوئے ہوں یا چادر، مردوں کا حق ہے کہ ان کا مکمل جائزہ لے کر ان کے جسمانی نشیب وفراز کا معائنہ کریں۔اس تربیت کا تیسرا جز یہ ہے کہ جو عورت برقع یا چادر نہ پہنے اس نے گویا کہ سارے مردوں کو ایک لائسنس دے دیا ہے کہ وہ اسے گھور کر دیکھیں، اس پر جملے کسیں اور جہاں ممکن ہو جسمانی اتصال کی کوئی شکل پیدا کریں۔اس تربیت کا چوتھا جز یہ ہے کہ کچھ خواتین نے اگر تنگ، باریک یا کسی قدر کھلے ہوئے کپڑے پہن رکھے ہوں تو پہلے ان کو جی بھر کے دیکھیں اور پھر ہر مجلس میں یہ وعظ کرتے پھریں کہ بے حیائی بہت پھیل گئی ہے۔

مرد وخواتین کی یہ صورتحال دراصل ہماری فکری قیادت کی اس ذہنیت کا بیان ہے جو قوم کی تربیت کر رہی ہے۔قرآن مجید سے بے بہرہ ایسے لوگ صرف خواتین کو پردے کی تلقین کرتے ہیں اور یہ بھول جاتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے یہ احکام دینا شروع کیے تو پہلے مردوں کو مخاطب کر کے ان کو سمجھایا ہے کہ اپنی نگاہوں کو نیچے رکھیں اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کریں۔اس کے بعد بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے خواتین کو بھی تلقین کی اور مردوں کے مقابلے میں کچھ زیادہ چیزوں کی تلقین کی۔مگران کے ابتدائی مخاطب مرد ہی ہیں۔

ہمیں اگر اپنے مردوں کو اس قابل شرم صورتحال سے نکالنا ہے تو ضروری ہے کہ قرآن مجید کی بنیاد پر لوگوں کی تربیت کرنا شروع کر دیں۔یہی اس مسئلے کا واحد حل ہے۔

اخلاقی بحران

بیگم کلثوم نواز کا لندن میں انتقال ہوگیا۔ پچھلے برس انھیں کینسر کی تشخیص ہوئی تھی جس کے بعد علاج کے لیے لندن لے جایا گیا تھا۔ ان کی زندگی کے آخری لمحوں میں ان کے شوہر اور بیٹی ایک سیاسی لڑائی بھی لڑتے رہے۔ اس پس منظر میں بیگم کلثوم نواز کی بیماری ہمارے معاشرے میں تیزی سے پھیلتی ہوئی بیمار ذہنیت کی ایک واضح نشانی بن کر سامنے آئی۔ ان کی بیماری پر جھوٹ، دھوکا اور ایک ڈرامہ ہونے کا الزام تواتر کے ساتھ لگایا گیا۔ حتیٰ کہ اعتزاز احسن جیسے سینیئر سیاستدان بھی اس الزامی مہم میں شامل ہوگئے۔ گرچہ اب اعتزاز احسن نے اس پر معذرت کی ہے، مگر اس وقت جب بیگم کلثوم نواز کی موت پر ان کی بیماری کو جھوٹا ثابت کرنے کا کوئی امکان باقی نہیں رہا۔

کہا جارہا ہے کہ پاکستان میں اس وقت پانی کا بحران ہے۔ پاکستان کو ایک مشکل معاشی بحران کا سامنا ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ اس وقت ہمیں ایک اخلاقی بحران کا سامنا ہے۔ ہمیں انتہا پسندی کی اس سوچ کا سامنا ہے جو مذہب کے بعد سیاست میں بھی غالب ہوچکی ہے۔ یہ انتہا پسندی لوگوں کو بنیادی اخلاقیات سے بھی بے بہرہ کررہی ہے۔

قومیں پانی کے بحران سے نہیں مرتیں، وہ قومیں بھی نہیں جو صحرا میں آباد ہوتی ہیں۔ قومیں بڑے سے بڑے معاشی بحران سے بھی نکل جایا کرتی ہیں۔ مگر تاریخ کا مطالعہ یہ بتاتا ہے کہ جو قومیں اخلاقی بحران کا شکار ہوجاتی ہیں، ایک مکمل تباہی ان کا مقدر بن جاتی ہے۔ ہمیں اس نوشتہ دیوار سے اگر بچنا ہے تو اخلاقی بحران کو اپنا سب سے بڑا مسئلہ بنانا ہوگا۔ انتہا پسندی کے اس جن کو قابو کرنا ہوگا جو بڑے بڑے دانشوروں کو عقل و خرد سے محروم کرچکا ہے۔ ہم نے اگر یہ نہیں کیا تو عالم کا پروردگار ہمیں تاریخ کے اس قانون سے کوئی استثنا نہیں دے گا جو اخلاقی طور پر پست اقوام کے بارے میں طے ہے۔ یعنی ایسی قومیں آخر کار تباہ و برباد ہوجاتی ہیں۔

ولن اور ہیرو

آج کل سیاسی گرما گرمی اور بحث و مباحثہ اپنے عروج پر ہے۔ ہر جماعت کے حمایتی دوسری جماعت کے لیڈروں کی شدید نفرت میں مبتلا نظر آتے ہیں۔ میں جب سوچتا ہوں کہ اس نفرت کی اصل وجہ کیا ہے تو اس کا ایک ہی جواب سامنے آتا ہے۔ یعنی وہ منفی سوچ جس کے تحت ہم ہمیشہ کسی نہ کسی ولن کی تلاش میں رہتے ہیں۔ ایسا ولن جس کے سر اپنے مسائل کی ساری ذمہ داری تھوپ کر ہم مزے سے اپنے دائرے میں تمام خرابیوں اور برائیوں کا ارتکاب کرتے رہیں۔

جبکہ حقیقت یہ ہے کہ ہمارے مسائل کی جڑ یہ ولن بنائے گئے لیڈر نہیں بلکہ ہم خود ہیں۔ ہمارے بیشتر مسائل جن کا سامنا ہمیں روز ہوتا ہے وہ ہمارے جیسے عام لوگوں ہی نے پیدا کرر کھے ہیں۔ ہم اپنی ذمہ داریوں اور فرائض سے بھاگتے ہیں۔ عدل، احسان، انفاق، ہمدردی اور خدمت کو اپنانے کے بجائے ہم خودغرضی، مفاد پرستی، خود پسندی، بے اصولی اور ناانصافی کی زندگی جیتے ہیں۔ حتیٰ کہ وہ کرپشن جس کا بہت شور ہے، اس میں بھی بیشتر حصہ عوامی کرپشن کا ہوتا ہے جس کا ارتکاب سرکاری ملازم، تاجر اور دیگر عوامی طبقات کرتے ہیں۔

اس منفی سوچ کے بجائے معاشرے میں اگر مثبت سوچ پھیل جائے تو لوگ ولن کی تلاش کے بجائے خود ہیرو بننے کی کوشش کریں گے۔ دوسروں پر انگلیاں اٹھا کر، اور ان کے خلاف جھوٹی سچی داستانیں پھیلانے کے بجائے اپنے دائرے میں اپنی ذمہ داریاں پوری کرنے کو اپنا طریقہ بنائیں گے۔ صبر، حلم، درگزر، خدمت، ایثار اور احسان کی روشنی سے اپنے اردگرد پھیلے اندھیرے کو دور کرنے کی کوشش کریں گے۔

حقیقت یہ ہے کہ ہمارے معاشرے کو کسی ولن کی نہیں ایک ہیرو کی ضرورت ہے۔ یہ ہیرو ہم میں سے ہر شخص بن سکتا ہے۔ مگر بدقسمتی سے کوئی شخص یہ کرنا نہیں چاہتا۔ کیونکہ ولن کو گالی دینا آسان کام ہے اور اپنے دائرے میں ہیرو بننا بہت مشکل کام ہے۔

لونڈی کا بیٹا

انسانی تاریخ میں ایک طویل عرصے تک لونڈی غلاموں کا رواج رہا ہے۔ ان لونڈی غلاموں پر ان کے مالکوں کو اتنا ہی اختیار ہوتا تھا جتنا آج ہمیں اپنے کپڑوں، برتنوں اور اپنی ملکیت کی دیگر چیزوں پر ہے۔ یہ گرچہ اپنی ذات میں ایک انتہائی مکروہ اور آج کے دور میں ناقابل تصور چیز ہے کہ انسان دوسروں کی اس طرح ملکیت بن جائیں لیکن ایک زمانے میں یہ انسانیت کی بہت بڑی سچائی تھی۔

تاہم اس حوالے سے دو باتیں ایسی ہیں جن کے متعلق عام طور پر موجودہ زمانے کے لوگ غلط فہمی کا شکار ہیں۔ ایک یہ کہ سارے آقا اپنے لونڈی غلاموں پر بہت ظلم کرتے تھے۔ یہ بات درست نہیں۔ اُس زمانے میں برے آقا بھی ہوتے تھے جو ظلم کرتے اور بڑے مہربان آقا بھی ہوتے تھے جو غلاموں سے بہت اچھا سلوک کرتے تھے۔

دوسری یہ کہ وہاں ہر لونڈی جنسی مقاصد کے لیے نہیں خریدی جاتی تھی۔ زمانہ قدیم میں غلامی کا ادارہ موجودہ دور کی سروس انڈسٹری کا کام کرتا تھا۔ اس لیے لونڈیوں کو رکھنے کا ایک مقصد گھر کے کام کاج کے لیے ملازم رکھنا ہوتا تھا۔ اچھے مالک غلاموں سے ان کی شادیاں کرا دیا کرتے تھے۔ ان کے بچے بھی ہوتے اور وہ اپنے شوہروں کے ساتھ اچھی زندگی گزارتی تھیں۔ ان کے بچے مالکوں کے گھروں میں ایسے ہی رہتے تھے جیسے آج کل گھروں میں کام کرنے والی ماسیوں کے چھوٹے بچے مالکوں کے گھروں میں آ جاتے ہیں۔

آج بھی اچھے لوگ اپنے ملازموں اور ماسیوں اور ان کے بچوں کے ساتھ نرمی کا سلوک کرتے ہیں۔ زمانہ قدیم میں بھی اچھے مالک اپنے لونڈی غلاموں اور ان کے بچوں کے ساتھ رحم کا برتاؤ کرتے تھے۔ یہ وہ پس منظر ہے جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور دیگر انبیا کی

دعاؤں میں اللہ تعالیٰ سے مخاطب ہوتے ہوئے ایک جملہ بارہا ملتا ہے۔ یعنی میں تیرے غلام کا بیٹا ہوں۔ میں تیری لونڈی کا بیٹا ہوں۔

یہ جملہ کوئی معمولی جملہ نہیں ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی رحمت کو متوجہ کرنے کا موثر ترین ذریعہ ہے۔ کریم اور مہربان آقا اپنے غلاموں پر تو شفیق ہوتے ہیں، مگر ان کی اولاد پر بدرجہ اولیٰ مہربان ہوتے ہیں۔ لونڈی غلام تو مالکوں کی کچھ نہ کچھ خدمت کر کے ان سے بدلہ پاتے ہیں، مگر لونڈی غلاموں کی اولادیں بلا استحقاق مالک کی نظر عنایت کی صرف اس وجہ سے مستحق ہو جاتی ہیں کہ وہ ان کے غلاموں کی اولاد ہیں۔

اللہ رب العالمین ہر چیز کا مالک ہے۔ ہر عورت اور مرد درحقیقت اس کے لونڈی غلام کی حیثیت رکھتا ہے۔ لیکن جب کوئی بندہ اپنے عزت و شرف کو ایک کونے میں رکھ کر صرف اپنے آپ ہی کو نہیں بلکہ اپنے باپ کو خدا کا غلام اور اپنی ماں جیسی صاحب عزت خاتون کو خدا کی لونڈی قرار دے کر اس کے سامنے فریاد کرتا ہے تو گویا وہ بالکل درست جگہ سے خدا سے مخاطب ہو رہا ہوتا ہے۔ اس لیے انسان ہی نہیں اس کے ماں باپ بھی خدا کے لونڈی غلام ہوتے ہیں۔

جو شخص خدا کو اس جگہ سے مخاطب کرنا شروع کر دے، اللہ تعالیٰ اس کی دعا ہر حال میں سنتے ہیں۔ اس کی مشکل ہر صورت میں دور کرتے ہیں۔ اس کی فریاد پر فوری توجہ کرتے ہیں۔ اس لیے کہ خدا اپنی کسی لونڈی کی فریاد سے تو کسی وجہ سے صرف نظر کر سکتا ہے، مگر لونڈی غلام کی اولاد کی فریاد کو کبھی نہیں ٹالتا۔ اس لیے کہ پکارنے والے نے اپنی عزت کو خاک میں ملا کر خدا کو پکارا ہوتا ہے۔ اپنے آپ کو پست ترین جگہ پر رکھ کر خدا کو پکارا ہوتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ خدا کو پکارنے کی سب سے درست جگہ وہی ہے جہاں انسان خود کو پست ترین سمجھ رہا ہو۔ جو یہاں سے خدا کو پکارتا ہے وہ کبھی خالی ہاتھ نہیں لوٹتا۔

مسائل کے حل کا دیرپا راستہ

پاکستان میں لوگوں کے نفسیاتی، سماجی، معاشی اور خاندانی مسائل ہر گزرتے دن کے ساتھ بڑھتے چلے جا رہے ہیں۔ ایسے میں یہ لوگوں کی اخلاقی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنے اردگرد موجود لوگوں کی جس پہلو سے مدد کرسکتے ہوں ضرور کریں۔

تاہم یہ ایک حقیقت ہے کہ جس رفتار سے یہ مسائل بڑھ رہے ہیں، مستقبل میں ہر دوسرا تیسرا فرد کسی نہ کسی پہلو سے ان مسائل کا شکار ہو چکا ہوگا۔ ایسے میں مسائل کا شکار لوگ زیادہ ہوں گے اور ان کو حل کرنے والے لوگ بہت کم رہ جائیں گے۔ چنانچہ لوگوں کے مسائل کو حل کرنے کی کوشش کرنا اصل مسئلے کا کوئی مستقل حل نہیں ہے۔

ان مسائل کی وجوہات کئی ہیں۔ نوجوانوں کے لیے بے روزگاری اور شادی میں تاخیر، بچوں کے لیے ماں باپ کے درمیان اختلافات، جھگڑوں اور طلاق کے واقعات جبکہ باقی لوگوں کے لیے غربت، بیماری، زندگی میں پیش آنے والی ناکامیاں اور مایوسیاں، دوسروں کی طرف سے پیش آنے والے ناخوشگوار واقعات وہ عام اسباب ہیں جنھوں نے مزاجوں میں چڑ چڑا پن، دل و دماغ میں مایوسی اور رویوں میں تلخی پیدا کردی ہے۔

تاہم ان وجوہات سے قطع نظر ہمارے نزدیک ان مسائل کا اصل تعلق ان وجوہات سے نہیں ہے۔ یہ وجوہات جنھیں زندگی کی منفی حقیقتیں کہا جاسکتا ہے، کم یا زیادہ، ہمیشہ زندگی کا حصہ رہے ہیں۔ مگر اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو یہ قابلیت عطا کی ہے کہ ان کو درست زاویہ نظر دے دیا جائے تو وہ ان سارے حالات کا بڑے حوصلے سے مقابلہ کرسکتے ہیں۔ مگر اس کے لیے ضروری ہے کہ انسانی نفوس کی صالح بنیادوں پر تربیت کی جائے۔

ہمارے نزدیک ہمارے معاشرے کا اصل المیہ یہ ہے کہ یہاں مثبت بنیادوں پر تربیت

دینے والے سارے ادارے اپنی جگہ چھوڑ چکے ہیں۔ والدین، خاندان کے بزرگ، محلے کے بڑے بوڑھے، اساتذہ، علماء اور دانشور غرض ہر گروہ نے تربیت کا اپنا کام چھوڑ دیا ہے۔ بلکہ کئی پہلوؤں سے منفی تربیت کا کام کر رہے ہیں۔ اس سے بڑھ کر سیاست اور مذہبی فکر میں در آنے والی انتہا پسندی اور میڈیا کی منفی، مایوسی کو بڑھاوا اور بے راہ روی کو فروغ دینے والی روش نے سونے پر سہاگہ کا کام کیا ہے۔ یہ وہ حالات ہیں جن میں ہمارا سوشل فیبرک تباہی کے دہانے پر آ پہنچا ہے۔

ایسے میں جتنی اہمیت اس بات کی ہے کہ لوگوں کے فوری مسائل کے حل کے لیے کام کیا جائے، اس سے کہیں زیادہ اہمیت اس بات کی ہے کہ تربیت کا ایک نیا نظام قائم کیا جائے۔ ایمان و اخلاق کی ان صالح بنیادوں پر لوگوں کو اعلیٰ اور حوصلہ مند انسان بنایا جائے جن کو قرآن مجید نے نجات کا معیار قرار دیا ہے۔

قرآن مجید کے بیان کردہ یہ اخلاقی معیارات قرآن کی اپنی اصطلاح میں اعمال صالح کہلاتے ہیں۔ ان کو اعمال صالح کہا ہی اس وجہ سے جاتا ہے کہ ان سے انفرادی اور اجتماعی زندگی میں فساد ختم ہوتا ہے اور ہر چیز درست ہو جاتی ہے۔ بدقسمتی سے ہمارے ہاں ان قرآنی معیارات کو ایک عام سی چیز سمجھا جاتا ہے۔ جبکہ حقیقت یہ ہے کہ ان چیزوں پر ہماری انفرادی اور اجتماعی زندگی کی ہر خیر منحصر ہے۔ ان کی اہمیت کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ انھی پر اللہ تعالیٰ نے آخرت کی نجات کو موقوف قرار دیا ہے۔ ہم نے ان تمام کو نہ صرف اپنی کتاب قرآن کا مطلوب انسان میں جمع کر دیا ہے بلکہ ان کی بنیاد پر لوگوں کی تعلیم و تربیت کا ایک سلسلہ شروع کر دیا ہے۔ یہ سلسلہ آگے بڑھے گا اور انشاء اللہ معاشرے میں اعلیٰ انسانوں کی ایک نئی فصل سامنے آنا شروع ہو جائے گی۔ یہی وہ لوگ ہوں گے جو معاشرے کے ہر شر کو خیر سے بدل دیں گے۔

خدا اور ارتقا

برٹنڈرسل (1872-1970) دور جدید کا وہ مفکر اور فلسفی ہے جس نے مغربی فکر اور اقدار کو بہت زیادہ متاثر کیا ہے۔ مثال کے طور پر آج کے مغرب میں ایک غیر شادی شدہ خاتون کے لیے عفت وعصمت کوئی قابل لحاظ چیز نہیں ہے۔ مگر مغرب ہمیشہ سے ایسا نہ تھا۔ انیسویں صدی کی وکٹورین اقدار کے تحت مغرب ایک عفت پسند معاشرہ تھا۔ مگر بیسویں صدی میں یہ برٹنڈ رسل ہی تھا جس نے اپنی مشہور کتاب Marriage and Morals میں اس تصور عفت کو دور جدید میں نا قابل عمل قرار دیا تھا۔ شروع میں اس کی سخت مخالفت ہوئی لیکن رفتہ رفتہ اس کی بات کو قبول کرلیا گیا اور بعد میں اس کتاب کی بنیاد پر اسے نوبل پرائز بھی ملا۔

اس نقطہ نظر کی قبولیت کی اساس یہ حقیقت تھی کہ صنعتی انقلاب کے بعد نوجوان تعلیم، ملازمت اور پھر صنعتی دور کی ایجادات کے بعد وجود میں آنے والے ایک خاص معیار زندگی تک پہنچتے پہنچتے تیس برس کی عمر کو پہنچ جاتے تھے۔ رسل کے سامنے سوال یہ تھا کہ شادی اگر اس عمر میں ہوگی تو اس انسانی ضرورت کا کیا ہوگا جو بلوغت کے فوراً بعد پوری شدت سے پیدا ہو جاتی ہے۔ چنانچہ اس کا حل یہ تھا کہ انسانی ضرورت کو شادی سے الگ کر دیا جائے۔ یوں ایک نوجوان خاتون یا مرد شادی تو تیس برس کی عمر کے لگ بھگ زندگی میں سیٹ ہونے کے بعد ہی کرے، لیکن اپنی انسانی ضرورت شادی کے بغیر پورا کرتا رہے۔ اس کا لازمی نتیجہ تصور عفت کا خاتمہ تھا۔

رسل کے اس حل نے بیسویں صدی کے مغرب میں ایک مسئلہ حل کیا لیکن کئی اور مسائل پیدا کر دیے۔ اس کی تفصیل ہماری اس تحریر کا موضوع نہیں ہے۔ لیکن سر دست ہم صرف یہ توجہ دلانا چاہتے ہیں کہ آج ہم ٹھیک اسی جگہ کھڑے ہوئے ہیں جس جگہ ایک صدی قبل مغرب کھڑا ہوا تھا۔

ظاہر ہے کہ ہم رسل کا بیان کردہ حل نہیں قبول کر سکتے۔ مگر بدقسمتی سے معاشرہ اتنے سنگین انسانی مسئلے کو حل کرنے کے لیے بالکل بے حس بنا ہوا ہے۔ جس کے نتیجے میں منافقت، جنسی انارکی اور بے راہ روی بڑھ رہی ہے۔ اس مسئلے کا ہمارے معاشرے اور ہماری مذہبی اقدار کے تحت کیا حل ہے، اس پر ہم نے پہلے بھی قلم اٹھایا تھا اور انشاء اللہ آئندہ بھی لکھتے رہیں گے۔ مگر یہ ایک الگ موضوع ہے۔ سر دست جو بات اس مثال سے واضح کرنی مقصود تھی وہ یہ کہ برٹنڈ رسل کا فکری طور پر مغرب میں کتنا اثر تھا اور آج تک ہے۔

رسل کا حوالہ آج جس پہلو سے دینا مقصود ہے وہ اس کا ایک دوسرا مضمون Why I Am Not a Christian ہے جو دراصل رسل کا ایک لیکچر ہے جو 1927 میں دیا گیا تھا۔ اس میں رسل نے وجود باری تعالیٰ کے حوالے سے دی جانے والی مختلف دلیلوں کو رد کیا ہے۔ یہ مضمون جو بہت مشہور ہوا بعد میں اسی موضوع سے متعلق بہت سے دیگر مضامین کے ساتھ ایک مجموعے کی شکل میں Why I Am Not a Christian کے عنوان ہی سے شائع ہوا۔ اس مجموعے کے مقدمے میں رسل نے مذہب اور وجود باری تعالیٰ کی نفی کرتے ہوئے ایک بڑی دلچسپ بات لکھی ہے۔ وہ اسی کے الفاظ میں درج ذیل ہے۔

"There is one of these arguments which is not purely logical. I mean the argument from design. This argument, however, was destroyed by Darwin"

رسل کا مطلب یہ ہے کہ خدا کے وجود کے حق میں پیش کیے جانے والے تمام دلائل ارسطو کی پیش کردہ قدیم یونانی منطق پر مبنی تھے جو ویسے ہی رد ہو چکی ہے۔ وہ ان دلائل میں واحد استثنا دنیا میں پائے جانے والے نظم کی بنیاد پر ایک ناظم یا خدا کے وجود کی دلیل کو سمجھتا ہے۔ تاہم اس کے

نزدیک یہ دلیل بھی ڈارون کے نظریہ ارتقا نے ختم کردی ہے۔ کیونکہ ارتقا کے نظریے نے یہ بتادیا ہے کہ دنیا میں زندگی اور اس میں اتنا تنوع کیسے وجود میں آیا۔اس کے لیے کسی خدا کو ماننے کی ضرورت نہیں ہے۔

تاہم یہ بات سمجھ لینا چاہیے کہ برٹنڈ رسل کا مسئلہ خدا نہیں مذہب ہے۔ اس نے اسی کتاب کے مقدمے میں خود واضح کیا ہے کہ وہ مذہب کو غلط ہی نہیں سمجھتا بلکہ اس کے ساتھ وہ اسے نقصان دہ بھی سمجھتا ہے۔

I am as firmly convinced that the religions do harm as I am that they are untrue.

یہ صرف برٹنڈ رسل کا معاملہ نہیں الحاد کے بیشتر پیروکار مذہب کے بارے میں ایسی ہی یا اس سے ملتی جلتی کوئی اور منفی رائے رکھتے ہیں۔ مذہب کے بارے میں اس رائے کی دو وجوہات برٹنڈ رسل اور دیگر ملحدین بیان کرتے ہیں۔ایک یہ کہ اہل مذہب اپنے عقائد اور تصورات کے سامنے کسی ثابت شدہ سچائی کو مانتے ہیں اور نہ اس کے خلاف کوئی عقلی استدلال قبول کرتے ہیں۔ جبکہ اہل مذہب کی دوسری روش یہ ہے کہ وہ تنقید کرنے والوں اور علم و عقل کی بات کرنے والوں کے دشمن بن کر کبھی انھیں قتل کردیتے ہیں، کبھی جیل اور نظر بندی کا نشانہ بناتے ہیں، کبھی ان کی کتابیں جلاتے ہیں اور کبھی تشدد سے کام لے کر ان کا راستہ روکتے ہیں۔اسی طرح اہل مذہب دوسرے مذاہب کے حوالے سے بھی عدم رواداری کا شکار ہوتے ہیں اور ان کو شکست دینے ،مٹادینے اور ان پر اپنا غلبہ قائم کرنے کے درپے رہتے ہیں۔

یہ وہ دو چیزیں ہیں جن کی بنا پر ملحدین مذہب کو ناحق اور نقصان دہ سمجھتے ہیں۔اور ظاہر ہے کہ مذہب کا تصور ہی خدا سے آتا ہے اس لیے مذہب کا انکار کرنے کے لیے ضروری ہے کہ خدا کا

انکار کیا جائے۔

اسلام کا جواب

ملحدین کا نقطہ نظر سامنے آنے کے بعد اب ضروری ہے کہ اس نقطہ نظر کا جائزہ لے کر دیکھا جائے کہ یہ کس درجہ میں معقولیت اور حقیقت پر مبنی ہے۔ اس حوالے سے پہلی بات ارتقا کا وہ نقطہ نظر ہے جس کے متعلق ملحدین کا خیال ہے کہ اس نے خدا کے تصور کی ضرورت کو ختم کر دیا ہے۔ جیسا کہ اوپر بیان ہوا ہے کہ خدا کے وجود پر شاہد کائنات کا یہ نظم جو زبان حال سے اپنے خالق کا تعارف ہے، بقول برٹنڈ رسل ڈارون اور اس کے نظریہ ارتقا نے اس دلیل کو ختم کر دیا ہے۔ اسی بنا پر ڈارون کے متعلق ملحدین یہ کہتے ہیں کہ اس نے معاذ اللہ خدا کو قتل کر دیا۔

اس نقطہ نظر کا جائزہ قرآن مجید کی روشنی میں لینے سے قبل یہ بتانا ضروی ہے کہ جس خدا کو قتل کرنے کا دعویٰ کیا جاتا ہے وہ مسیحیوں کا وہ خدا تھا جس نے زمین کو 4004 قبل مسیح 22 اکتوبر کی شام بنایا تھا۔ جس نے صبح و شام کے وقفے میں ایک ہی دن میں ساری مخلوقات کو پیدا کر دیا تھا۔ اور جس نے ہفتے کے چھ دنوں میں پوری کائنات بنا دی اور ساتویں دن آرام کیا۔ ظاہر ہے کہ مذہب اور خدا کے نام پر جب ایسے دعوے کیے جائیں گے تو پھر وہی ہونا بھی ہے جو پیچھے بیان ہوا ہے۔

تاہم نزول قرآن کے بعد اب خدا کی بات جاننے کا واحد قابل اعتماد ذریعہ قرآن مجید ہے۔ چنانچہ جب ہم قرآن مجید کو دیکھتے ہیں تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ قرآن مجید بھی تخلیق کائنات، انسان اور دیگر مخلوقات کی تخلیق اور انفس و آفاق کے آثار پر بار بار گفتگو کر رہا ہے، مگر مجال ہے کہ قرآن میں ایک لفظ بھی ایسا پایا جائے جسے سائنس کی کسی بھی ترقی نے غلط ثابت کر دیا ہو۔

اس کے بالکل برعکس محسوس ہوتا ہے کہ قرآن مجید اپنے ابدی اسلوب میں گویا انھی سوالات کا

جواب دے رہا ہے جو آج کے انسان کے ذہن میں الحادی فکر نے پیدا کردیے ہیں۔ قرآن مجید کائنات میں ہر سو پھیلی قدرت، ربوبیت اور حکمت کی نشانیوں کو بنیاد بنا کر ایک واضح سچائی کو لوگوں کے سامنے رکھتا ہے۔ وہ یہ کہ یہ کائنات جو ہر پہلو سے مجموعہ اضداد ہے اور مختلف عناصر سے مل کر بنی ہے اور جس کی تمام طاقتیں زندگی کے لیے موت کا پیغام لاتی ہیں، اچانک اس کرہ ارض کے لیے ایک بالکل جدا روپ اختیار کرلیتی ہے۔ یہاں ہر کائناتی قوت اور عنصر زندگی کے فروغ اور اس کی بقا کی خدمت پر مامور ہے۔ قرآن کا دعویٰ ہے کہ یہ سب کچھ اللہ رب العالمین کی ہستی نے کیا ہے۔

یہی وہ بات ہے جس کے متعلق برٹنڈ رسل کا دعویٰ ہے کہ اسے ارتقا نے باطل کردیا ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیسے باطل کیا ہے؟ برٹنڈ رسل نے اپنے استدلال کی تفصیل Why I am not a christian میں اس طرح کی ہے۔

It is not that their environment was made to be suitable to them, but that they grew to be suitable to it, and that is the basis of adaptation. There is no evidence of design about it.

اس کا مدعا یہ ہے کہ حیات کے لیے موزوں ماحول کا مطلب یہ نہیں کہ کسی خدا نے زندگی کو پیدا کرنے کے لیے اس زمین پر زندگی کے لیے سازگار ماحول کو پیدا کیا۔ بلکہ اصل بات یہ ہے کہ اس ماحول کی وجہ سے زندگی نے جنم لیا اور پھر وہ زمین پر ہر جگہ اس ماحول کے لحاظ سے مختلف شکلوں میں ڈھلتی چلی گئی۔ اس لیے نظم کائنات یا ڈیزائن کی بنیاد پر خدا کے ہونے کی بات کرنے کوئی ثبوت نہیں۔

برٹنڈرسل کے استدلال کی کمزوری

بظاہر یہ بات بڑی مضبوط معلوم ہوتی ہے، مگر حقیقت میں اس سے زیادہ کمزور اور بودی بات نہیں ہوسکتی۔ اگر یہ بات درست ہے تو پھر چاند پر چاند کے ماحول اور حالات کے لحاظ سے ایک خاص طرح کی زندگی وجود میں آجانی چاہیے تھی۔ مریخ پر مریخ کے حالات کے لحاظ سے ایک طرح کی زندگی وجود میں آجانی چاہیے تھی۔ اسی طرح دیگر سیاروں کا بھی معاملہ ہے۔ مگر ہم جانتے ہیں کہ ایسا کچھ بھی نہیں ہوا۔ انسان چاند پر جاچکا ہے۔ مریخ پر اس کی بنائی ہوئی مشینیں اتر چکی ہیں۔ جبکہ اس کے بنائے ہوئے خلائی جہاز پورے نظام شمسی کا سفر کر کے اس سے باہر نکل چکے ہیں۔ زندگی کہیں نہیں ملی۔ جبکہ اس اصول کے مطابق تو ہر جگہ زندگی کی کسی نہ کسی شکل کو ہونا چاہیے تھا۔

حقیقت یہ ہے کہ زندگی کو بنانے اور باقی رہنے کے لیے ایک انتہائی خاص قسم کا ماحول چاہیے۔ اگر زندگی کی توجیہہ یہ کہہ کر کی جائے گی کہ یہ ماحول کی پیدا کردہ ہے تو اگلا سوال یہ پیدا ہوجائے گا کہ یہ ماحول کیسے وجود میں آ گیا؟ خود سائنسدان یہ تسلیم کرتے ہیں کہ زندگی کو وجود میں لانے کے لیے کسی سیارے پر متعدد عوامل کا موجود ہونا ضروری ہے۔ ساٹھ کی دہائی میں مشہور ماہر فلکیات اور ملحد دانشور کارن ساگان نے ان کی تعداد دو بتائی تھی اور اب سائنسدان ان کی تعداد دوسو سے زائد بتاتے ہیں۔ جبکہ سائنسی دریافتوں کے ساتھ ان عوامل کی تعداد مزید بڑھے گی۔ یہ سارے عوامل ایک ساتھ کسی سیارے پر اتفاق سے جمع ہوجائیں ایسا ہونا خالص حسابی بنیادوں پر بھی بہت مشکل بلکہ ناممکن ہے۔ پھر مسئلہ صرف زندگی کے وجود میں آنے کا نہیں بلکہ کائنات کے وجود میں آنے اور باقی رہنے کا ہے۔ یہ کائنات جن عناصر سے مل کر بنی ہے جو قوتیں اس میں کارفرما ہیں، وہ جب تک ایک خاص ترتیب میں نہ ہوں یہ کائنات نہ بن سکتی تھی نہ باقی رہ سکتی

ہے۔

خدا کو ماننا ایک عقلی تقاضا ہے

ہم نے اپنی کتاب ''قسم اُس وقت کی'' میں مذہب مخالف تمام سوالات کو جمع کر کے ان کے جواب دیے ہیں۔ وہیں ہم نے ناول کی مرکزی کردار ناعمہ کے نام کی مثال دے کر یہ واضح کیا ہے کہ جو لوگ محض بخت و اتفاق کو ایسی بامعنی اور بامقصد چیزوں کے وجود میں آنے کا ذریعہ سمجھتے ہیں وہ جان لیں کہ یہ حسابی طور پر ناممکن ہے۔ اندازہ کیجیے کہ اس بات کو یقینی بنانے کے لیے کہ انگریزی زبان کے چھبیس حروف تہجی میں سے پانچ حروف پر مشتمل لفظ Naima وجود میں آئے، 78,93,600 منفرد الفاظ لکھنے ضروری ہیں۔ یہ اتفاق کو بنیاد بنا کر محض ایک لفظ لکھنے کا معاملہ ہے۔ دوسری طرف کائنات جیسی جگہ میں جہاں مختلف قسم اور تعداد کے سب اٹامک پارٹیکل، ایٹم، مالیکیول، عناصر اور ان سے مل کر وجود میں آنے والے لاتعداد عوامل پائے جاتے ہیں، وہاں زندگی کا وجود میں آنا اور اس کے لیے درکار دو سو سے زائد عوامل کا محض اتفاق سے جمع ہو جانا عملاً ناممکن ہے۔ کائنات میں کھربوں کو کھربوں سے ضرب دے کر جو عدد حاصل ہو، کائنات میں موجود سیاروں کی تعداد اگر اس سے بھی زیادہ ہو تب بھی اتنے زیادہ عوامل کا کہیں ایک ساتھ جمع ہو جانا اتفاق سے نہیں ہو سکتا۔

اس لیے ہم بہت اعتماد سے یہ کہتے ہیں کہ موجودہ دور میں سائنس نے کائنات اور زندگی سے متعلق جن حقائق کو کھول کر رکھ دیا ہے ان کے بعد ایک خالق کو ماننا کسی اندھے عقیدے کا معاملہ نہیں بلکہ ایک لازمی عقلی تقاضا ہے۔ ہاں خدا کا انکار کرنا ایک اندھا عقیدہ ہے جو علم و عقل کے خلاف ہے۔

خدا کو ماننا کس طرح ایک عقلی تقاضا ہے اس کا اندازہ اس بات سے کیا جا سکتا ہے کہ ملحدین

بھی جب ارتقا کی روشنی میں زندگی کے تنوع اور پیچیدگی کو بیان کرتے ہیں تو قدم قدم پر یہ کہنے پر مجبور ہوجاتے ہیں کہ نیچر نے فلاں موقع پر یہ کردیا۔ اس کا سادہ مطلب یہ ہے کہ کسی چیز کی تخلیق یا اس کی زندگی سے موافقت کی توجیہ کرنے کے لیے اہل مذہب خدا کا نام لیتے ہیں، ملحدین ایسے سارے مواقع پر فطرت یا نیچر کا نام لے دیتے ہیں۔ ایسے میں صرف یہی عرض کیا جاسکتا ہے کہ آپ نے خدا کا انکار نہیں کیا۔ اپنے خدا کا نام بدل کر نیچر رکھ دیا ہے۔ آپ اس ''خدا'' سے سارے کام خدا ہی کے لے رہے ہیں۔ بس اسے خدا ماننے کے لیے تیار نہیں ہیں۔

اس پر مستزاد یہ حقیقت ہے کہ آپ اس نظم کائنات کو طبعی یا حیاتیاتی قانون کا نتیجہ سمجھتے ہیں، تب بھی اگلے لمحے یہ سوال پیدا ہوجاتا ہے کہ ایسا بامعنی اور بامقصد قانون کس نے بنایا۔ آپ کہیں گے کہ کائنات نے 13.7 ارب سال کی مدت میں یہ قوانین خود ہی بنالیے۔ ہم یہ عرض کریں گے کہ اب آپ نے خدا کا کام کائنات سے لیتے ہوئے اپنے خدا کا نام کائنات رکھ لیا۔ تاہم یہ جان لیجیے کہ آپ کا یہ خدا کسی بت سے بالکل مختلف نہیں۔ یہ بھی ایک بت کی طرح بے جان اور بے شعور مادہ ہے اور کچھ نہیں۔

ویسے قارئین کی معلومات کے لیے عرض ہے کہ یہ بھی ایک ہوائی بات ہے کہ کائنات نے اربوں برس میں خود ہی قوانین بنالیے۔ سائنس نے اب یہ بتادیا ہے کہ بگ بینگ کے پہلے لمحے کے اندر اندر ہی طبعی قوانین نے اپنا کام شروع کردیا تھا۔ یہ نہ ہوتا تو کائنات اپنی پیدائش کے پہلے لمحے ہی میں ختم ہوجاتی۔ سائنس کا ہر طالب علم جانتا ہے کہ اس کائنات میں چار بنیادی طاقتیں کارفرما ہیں۔ قوت کشش، الیکٹرومیگنیٹک قوت، طاقتور نیوکلیائی قوت، کمزور نیوکلیائی قوت۔ سائنس دان بتاتے ہیں کہ یہ قوتیں بگ بینگ کے پہلے سیکنڈ ہی میں فعال ہوگئی تھیں اور ان کی ویلیو یا مقدار اسی وقت طے ہوگئی تھی۔ سوال یہ ہے کہ اتنے کم وقت میں کون سا ارتقا ہوسکتا

ہے؟ یہ صرف اور صرف ایک با اختیار، طاقتور، علیم و حکیم ہستی کا کام ہے ۔ یہی خدا ہے ۔ یہی خدا ہے۔

مذہب پر کیے جانے والے اعتراضات کی حقیقت

اس کے بعد اگلی چیز مذہب پر کیے جانے والے دو اعتراضات ہیں۔ یعنی مذہب عقل کے خلاف ہے اور یہ کہ اس کے پیروکاروں میں عدم برداشت اور نفرت پائی جاتی ہے۔ اس اعتراض کا جواب یہ ہے کہ اس دنیا میں مذہب کے نام پر دو چیزیں پائی جاتی ہیں۔ ایک خدا کا نازل کردہ مذہب جو صرف اور صرف قرآن مجید اور سیرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں پایا جاتا ہے۔ دوسرا وہ مذہب جو دنیا کے تمام مذہبی گروہ بشمول مسلمان اختیار کیے ہوئے ہیں۔ یہی وہ دوسرا مذہب ہے جو ہمیشہ دنیا کے سامنے آتا ہے۔ ہم تفہیم مدعا کے لیے پہلے مذہب کو الہامی مذہب اور دوسرے کو انسانی مذہب کہہ لیتے ہیں۔ بدقسمتی سے ملحدین جو اعتراض کرتے ہیں وہ اس انسانی مذہب کے بارے میں بالکل درست ہے۔ انسانی فکر کی آمیزشوں اور انحرافات کے ساتھ مذہب میں ہمیشہ یہ مسائل پیدا ہو جاتے ہیں۔

تاہم الہامی مذہب جو دین اسلام ہے۔ اپنی اصل تعلیم کے لحاظ سے ایک بالکل مختلف جگہ پر کھڑا ہے۔ قرآن اپنے نہ ماننے والوں کے درمیان نازل ہوتا تھا۔ اس کے پاس اپنی بات منوانے کا ایک ہی راستہ تھا۔ وہ یہ کہ اپنی بات کو دلائل سے ثابت کیا جائے۔ چنانچہ قرآن کی پوری دعوت نہ صرف عقلی دلائل پر کھڑی ہے بلکہ وہ بار بار یہ کہتا ہے کہ حقیقت اگر اسلام کے دعووں کے برعکس ہے تو اسے سامنے لایا جائے۔ اگر کوئی دلیل ہے تو پیش کی جائے۔ اگر سچائی کچھ مختلف ہے تو قرآن پیغمبر اسلام سے کہلواتا ہے کہ میں سب سے پہلے اسے قبول کروں گا۔ اس سے بڑھ کر معقولیت کا رویہ اور عقلی استدلال کو قبول کرنے کی روش اور کیا ہو گی؟

جہاں تک رواداری اور عدم برداشت کا معاملہ ہے تو اس میں قرآن مجید نے ایک بے مثال اصول دے دیا ہے۔ لا اکراہ فی الدین۔ یعنی دین میں کوئی جبر نہیں۔ مذہب بندے اور خدا کا معاملہ ہے۔ لوگوں کو ماننا ہے تو مانیں اور نہیں ماننا تو نہ مانیں۔ خدا کا کام حق پہنچانا اور سمجھانا ہے۔ یہ دنیا امتحان کے لیے بنائی گئی ہے۔ یہاں مکمل آزادی ہے۔ لوگوں کا دل چاہے تو دین حق کو مانیں اور نہ چاہے تو نہ مانیں۔ اللہ نے اس بنیاد پر کوئی سزا و جزا اس دنیا میں برپا نہیں کرنی۔

ہاں ایک روز آئے گا جب اللہ تعالیٰ غیب کا پردہ اٹھا کر خود سامنے آ جائیں گے۔ اس روز کوئی شخص خدا کا انکار نہیں کر سکے گا۔ اس روز ہر شخص سے پوچھا جائے گا کہ آزادی اور نعمتیں پا کر سرکش ہوئے یا بندگی اور نیکی کی راہ پر چلے۔ جو لوگ سرکش ہوئے اور حق کو جھٹلاتے رہے وہ اپنے انجام کو پہنچیں گے۔ رہے بندگی اور نیکی کی راہ پر چلنے والے تو یہ کائنات ہمیشہ کے لیے ان کے تصرف میں دے دی جائے گی۔

اصل مسئلہ یہ نہیں کہ سچائی اور اس کے دلائل یہاں موجود نہیں۔ اصل مسئلہ وہ انسانی مذاہب ہیں جو خدا کے نام پر کھڑے ہو کر لوگوں کو غیر عقلی باتیں بتاتے اور نفرت اور عدم برداشت کا سبق دیتے ہیں۔ الہامی مذہب عقلی بھی ہے اور آزادی کا علمبردار بھی ہے۔ یہی اسلام ہے جو تا قیامت انسانیت کے لیے کافی رہنما ہے۔

خورشید ندیم

خطیب اور مذہب

اِن دنوں سوشل میڈیا پر کچھ مذہبی خطبا اور واعظین کا چرچا ہے۔ زیادہ تر استہزا کا موضوع ہیں۔ سبب اُن کے بیان کردہ کچھ قصے ہیں جنہیں جدید ذہن قبول نہیں کرتا۔ اس کی آڑ میں کچھ لوگ مذہب کے مقدمے ہی کو فی الجملہ غیر عقلی ثابت کر رہے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ کیا یہ خطیب اور واعظ مذہب کے حقیقی نمائندے ہیں؟

خطابت ایک فن ہے۔ یکے از فنونِ لطیفہ۔ اسے اداکاری کی ایک قسم سمجھیے۔ خطیب ذہن سے زیادہ لوگوں کے دل کو مخاطب بناتا ہے۔ کبھی ہنساتا تو کبھی رلاتا ہے۔ وہ انہیں اپنے الفاظ، لہجے اور حرکات سے سحر زدہ کرتا اور پھر ان کے دل اور دماغ کو کچھ وقت کے لیے اپنی مٹھی میں لے لیتا ہے؛ تاہم یہ جادو کچھ دیر ہی کے لیے کارگر ہوتا ہے، جیسے کوئی گیت آپ کو رلا دے۔ جیسے کسی فلم کا کوئی منظر آپ کو اپنی گرفت میں لے لے۔ گیت ختم ہوتا ہے تو آہستہ آہستہ اس کا تاثر کم ہوتا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ آپ واپس حقیقت کی دنیا میں لوٹ آتے ہیں۔ یہی معاملہ فلم کا ہے۔ ہال میں کبھی سسکیاں سنائی دیتی ہیں اور کبھی قہقہے۔ جب فلم ختم ہوتی اور بجلی کے قمقمے روشن ہو کر فلم کے خاتمے کا اعلان کرتے ہیں تو ناظرین ان سسکیوں اور قہقہوں کو ہال میں چھوڑ کر گھروں کو لوٹ جاتے ہیں۔

فنونِ لطیفہ سے لوگ حظ اٹھاتے ہیں۔ یہ تفریح کا ایک ذریعہ ہیں۔ خطابت بھی اسی کے لیے ہے۔ میرا تعلق ایک مذہبی گھرانے سے ہے۔ والدِ محترم دین کے ایک عالم تھے اور گھر کا ماحول اسی رنگ میں رنگا ہوا تھا۔ نوجوانی تک تفریح کے کسی مروجہ طریقے سے لطف اٹھانے کا موقع نہیں ملا۔ حسرت سے لوگوں کو دیکھتے اور اپنی محرومی پر افسردہ رہتے تھے۔ اُن دنوں ہمارے پاس تفریح

کا ایک ہی ذریعہ تھا: مذہبی خطیبوں کی تقریریں۔ اس کے لیے دور دور تک کا سفر کیا۔ میلوں پیدل چلے۔ کئی راتیں مسجد کے فرش پہ گزاریں۔ ایک خوش الحان خطیب کی تقریر سے جو مزا اٹھاتے، اس کے سامنے یہ مشکلات ہیچ لگتیں۔ سید عطاءاللہ شاہ بخاری نے اسی وجہ سے اپنے سامعین کو 'کانوں کا عیاش' قرار دیا تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ تفریح انسان کی فطری ضرورت ہے۔ اگر ہم جبر سے اس کا راستہ روکیں گے تو یہ کوئی متبادل راہ تلاش کر لے گی۔ اہلِ مذہب نے فنونِ لطیفہ کے دروازے بند کیے تو مذہب اس مقصد کے لیے استعمال ہونے لگا۔

شورش کاشمیری اپنے وقت کے ایک بڑے خطیب تھے۔ انہوں نے 'فنِ خطابت' کے عنوان سے ایک مختصر کتاب لکھی۔ مجھے ان کی یہ کتاب سب سے زیادہ پسند ہے۔ ڈاکٹر سید عبداللہ نے اس کے مقدمے میں اس حسرت کا اظہار کیا کہ کاش شورش اس طرح کی دو چار کتابیں اور بھی لکھ جاتے۔ کتاب کے آغاز میں انہوں نے ایک چارٹ بنایا ہے جس میں اجزائے خطابت کو بیان کیا گیا ہے۔ انہوں نے بتایا ہے کہ کامیاب تقریر میں آواز کا حصہ کتنے فی صد ہے۔ تکنیک کا کتنے فی صد اور اشارات کا کتنے فی صد۔ انہوں نے ایسے بارہ اجزا کا ذکر کیا ہے۔

مذہبی خطیب بالعموم اپنے خاص حلقے ہی میں پسند کیے جاتے ہیں۔ اس میں استثنا بہت کم ہے۔ عام طور پر اس پسندیدگی کی وجہ یہ ہے کہ وہ سامعین کے مزاج شناس ہوتے اور ان کی خواہش کے مطابق کلام کرتے ہیں۔ وہی کچھ کہتے ہیں جو لوگ سننا چاہتے ہیں۔ سید عطاءاللہ شاہ بخاری ہی نے ایک بار کہا تھا کہ ہم لوگوں کے چہرے دیکھ کر اپنے موضوع کا انتخاب کرتے ہیں۔ ان حلقوں میں خطیب کی باتوں کے لیے پہلے ہی سے قبولیت موجود ہوتی ہے۔ یہ معلوم ہے کہ مسلکی خطیبوں کو ان تقریروں کا معاوضہ لاکھوں میں ملتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ ہر مسلک کے ماننے والوں کو ایسے دلائل فراہم کرتے ہیں جس سے وہ اپنی مذہبی وابستگی میں مزید پختہ ہوتے

ہیں اور انہیں یہ اطمینان ہوتا ہے کہ ان کا مسلک ہی برحق ہے۔

ایک خطیب کے پیشِ نظر جب یہی کچھ ہوتا ہے تو پھر صحتِ فکر یا صحتِ واقعہ اس کے لیے اہمیت نہیں رکھتے۔ پھر وہ رطب و یابس جمع کرتا اور لوگوں کے کانوں میں انڈیل دیتا ہے جس سے وہ خوش ہو جائیں۔ لوگ گھنٹے، دو گھنٹے کے لیے محظوظ ہو لیتے ہیں۔ خطیب کو اس سے غرض نہیں ہوتی کہ اس کا بیان کردہ واقعہ مصدقہ تھا یا نہیں۔ راوی ثقہ تھا یا غیر ثقہ۔ اس کا برآمد شدہ نتیجہ فکر علم و عقل کی کسوٹی پر پورا اترتا ہے یا نہیں۔

بعض اوقات ایک خطیب کسی اچھے جذبے کے ساتھ بھی یہ سب کچھ کرتا ہے۔ لوگوں کو نیک اعمال کی طرف مائل کرنے کے لیے ایسی روایات اور قصے سنائے جاتے ہیں، جن کے بارے میں خطیب کو معلوم ہوتا ہے کہ مستند نہیں ہیں۔ میں نے ایک مرتبہ اپنے کالم میں ایک معروف داعی کا ذکر کیا کہ ان کے جذبے میں کچھ کلام نہیں مگر وہ دین کے نام پر غیر مصدقہ روایات پیش کرتے ہیں۔ اس پر ان کا فون آیا کہ فضائل اور نیک مقصد کے لیے علما نے اسے جائز کہا ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ جذبہ کتنا ہی صادق کیوں نہ ہو، اس بے احتیاطی سے دین کو نقصان پہنچتا ہے۔ جب ہم کمزور روایات کو معیار مان لیتے ہیں تو پھر کوئی فتنہ پرور اسی طرح کے قصوں کہانیوں کو اٹھاتا اور دین ہی کو استہزا کا موضوع بنا لیتا ہے۔ خطیب یا واعظ ان نتائج سے لا پروا ہوتا ہے۔ لوگ اس کی تقریر سے حظ اٹھاتے ہیں لیکن اس کی پھیلائی ہوئی بے بنیاد باتوں کا بار مذہب کو اٹھانا پڑتا ہے۔

ہمارے مذہب کا مقدمہ عقلی اور تاریخی محکمات پر قائم ہے: قرآن مجید، سنت اور سیرتِ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم۔ قرآن مجید ایک محکم علمی دستاویز اور زبان و بیان کا معجزہ ہے۔ اللہ کے آخری رسول سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا ظہور تاریخ کے اجالے میں ہوا جن کی حیاتِ مبارکہ کے

ایک ایک ورق پر تاریخ کی مہرِ تصدیق ثبت ہے۔ دین ان محکم بنیادوں ہی سے معلوم کیا جائے گا۔قرآن مجید نے خود دین کی تکمیل کا اعلان کیا۔ گویا قرآن کا نزول تمام ہوا اور اللہ کے رسول اس کا مکمل ابلاغ کرنے کے بعد دنیا سے رخصت ہوئے۔اس کے بعد اس میں کوئی اضافہ کیا جا سکتا ہے نہ کمی لائی جاسکتی ہے۔

اس دین کو آپ اپنی زندگی میں جاری فرما گئے۔ یہ دین صرف قرآن اور سنت سے ثابت ہے۔اس پر عمل کا مثالی طریقہ آپ کا اسوہ حسنہ ہے۔ دین جاننے کے لیے اب انہی کی طرف رجوع کیا جائے گا۔ان کی تفہیم کے لیے ہم دین کے جید علما ہی سے مدد لیں گے۔ان کے علاوہ قصے کہانیاں دین کا ماخذ نہیں بن سکتے، چاہے کتنے نیک جذبے ہی سے کیوں نہ بیان کیے جائیں۔اب دین کی دعوت وہی ہوگی جو قرآن مجید کی بنیاد پر اٹھے گی۔خود رسالت مآب کو اللہ تعالیٰ نے یہی حکم دیا کہ آپ اس قرآن کے ساتھ انذار کریں۔(الانعام)۔

اگر لوگوں کو قیامت اور جہنم کی سختی کے بارے میں خبر دار کرنا ہے تو قرآن مجید سے موثر بات کس کی ہوسکتی ہے؟ آخری سورتوں میں بالخصوص جو نقشہ کھینچا گیا ہے، یہ واقعہ ہے کہ پڑھ کر دل دہل جاتے ہیں اگر زندہ ہوں۔اگر جنت کا نقشہ بیان کیا جانا ہے تو قرآن مجید سے بہتر تصویر کشی کون کر سکتا ہے۔معلوم نہیں کیوں لوگ جنت کی کشش پیدا کرنے کے لیے اُن قصوں کو بیان کرتے ہیں جن کے بارے میں وہ خود جانتے ہیں کہ مصدقہ نہیں۔ رہے مسلکی خطیب تو ان کا مسئلہ دین نہیں، وہ نظر بند سامعین ہیں جنہیں ان کے مسلک پر مزید پختہ کرنا ہے۔

اس لیے میری درخواست ہے کہ ان خطبا اور واعظین کی تقاریر کو سنجیدہ لینے کی ضرورت نہیں۔ان سے حظ اٹھائیے کہ یہ خطابت تفریح کا محل ہے، غور وفکر کا مقام نہیں۔ دین کو اگر سنجیدگی سے جاننا ہے تو پھر اس کا ماخذ قرآن وسنت ہیں اور اللہ کے آخری رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوہ۔

بشکریہ: روزنامہ دنیا

پروفیسر ڈاکٹر محمد عقیل

من پر قابو کیسے؟

حضرت، چند باتیں بہت پریشان کرتی ہیں؟ میں نے حضرت سے پوچھا

پوچھو کیا مسئلہ ہے؟ حضرت نے جواب دیا۔

حضرت، گو کہ میں جانتا ہوں صحیح کیا ہے اور غلط کیا ہے؟ لیکن پھر بھی خود پر قابو نہیں۔ اس مسئلے کا کیا حل ہے؟

بھئی دیکھو، محض یہ جاننا ضروری نہیں کہ صحیح کیا ہے اور غلط کیا ہے؟ سب سے پہلے تو ''خود'' کو جاننا ضروری ہے۔

اچھا؟ تو پہلے وہی بتائیے۔ میں نے دلچسپی لیتے ہوئے پوچھا۔

دیکھو میاں، ایک کار کا تصور کرو۔ اس کار کا مالک پچھلی سیٹ پر بیٹھا ہے۔ دوسرا شخص ڈرائیور جو اس کا ملازم ہے وہ کار چلا رہا ہے اور تیسرا فریق وہ کار ہے جس میں یہ دونوں بیٹھے ہیں۔ اب یوں سمجھو کہ یہ کار ہمارا مادی وجود یعنی جسم ہے، ڈرائیور ہمارا مائینڈ اور مالک ہم خود یعنی ہماری اپنی شخصیت۔

وہ کیسے؟ میں نے شوق سے پوچھا۔

دیکھو، اس کار کا ایک ظاہری ڈھانچہ ہے جو سمجھ لو ہمارا ظاہری بدن ہے۔ اس کار کا اندرونی نظام جیسے انجن، الیکٹرک کا نظام وغیرہ ہمارے جسم کے اندرونی اعضاء کی مانند ہیں جیسے دل، گردے پھیپھڑے وغیرہ

اچھا کیا کار خود بخود چل سکتی ہے؟

نہیں، میں نے جواب دیا۔ اسے پٹرول کی ضرورت ہے جیسے انسان کو غذا کی۔

ارے بھئی، اگر پٹرول بھی ہو تو کیا خود بخود چل سکتی ہے یا کوئی چلانے والا ہونا چاہیے؟ حضرت

نے دوبارہ پوچھا۔

جی بالکل، ایک ڈرائیور ہوتا ہے جو اسے چلاتا ہے۔

تو بس سمجھ لو، جس طرح کار کو چلانے کے لیے ڈرائیور ہوتا ہے، ایسے ہی جسم کو چلانے کے لیے مائینڈ یا دماغ ہوتا ہے جسے قدیم اصطلاح میں دل بھی کہا جاتا ہے۔

بس تو سمجھ لو، ڈرائیور کے پیچھے بیٹھا مالک ہماری اپنی شخصیت ہے جسے قدیم اصطلاح میں خودی، انا، نفس وغیرہ کہا جاتا ہے۔اب کچھ سمجھے کہ معاملہ کیا ہے؟ حضرت نے پوچھا۔

اوہ، یہ تو گتھی سلجھتی جارہی ہے۔ کار میرا جسم ہے، ڈرائیور، میرا دل یا مائینڈ اور اس کے پیچھے بیٹھا ہوا شخص ان سب چیزوں کا مالک یعنی میں ہوں۔ میں نے کہا۔

ہاں بس ایک اور چیز کا اضافہ کرلو۔ کار کے شیشے اور کھڑکیاں انسان کے اعضا یعنی ناک، کان، آنکھیں، زبان اور لمس کی مثال ہیں جن سے میں باہر کی دنیا سے رابطہ رکھتا ہوں۔

پس جان لو کہ کار ہمارا جسم ہے، مالک ہمارا باطن اور ڈرائیور ہمارا دل، کھڑکیاں اور دروازے ہمارے ناک، کان، زبان، لمس اور آنکھیں اور کار سے باہر باقی دنیا موجود ہے۔

اب سوچو، اگر ڈرائیور اپنے مالک سے باغی ہوکر اپنی مرضی چلانے لگے، وہ کھڑکی سے نظر آنے والے ہر خوبصورت منظر کو غور سے دیکھے، باہر کے دل کش میوزک ہی کو سننے کے لیے رک جائے، ساتھ چلنے والی کاروں کے ڈرائیوروں سے بات کرتا رہے، جہاں چاہے کار کو لیے پھرے، کسی قانون کی پابندی نہ کرے، نہ سگنل پر رکے نہ اسپیڈ کا خیال رکھے اور نہ ہی سڑک پر موجود دوسری گاڑیوں کو خاطر میں لائے تو کیا مالک کبھی اپنی منزل تک پہنچ پائے گا؟ اس کا انجام کیا ہوگا؟

یہ شخص تو اپنے مالک کو بھی حادثے سے دوچار کرے گا اور اپنی کار کو بھی۔ میں نے کہا۔

بس تو جان لو، جس شخصیت کے قابو میں اس کا اپنا ڈرائیور یعنی دل نہیں وہ اپنے جسم اور روح یا ظاہر و باطن دونوں کی ہلاکت کی تیاری کر رہا ہے۔ اور یہ بھی جان لو کہ ڈرائیور یعنی دل کو قابو نہ کیا

جائے تو یہ آزادی کی مستی میں کبھی جنسی لذت کی کھائیوں کی جانب دوڑے گا تو کبھی نشے کی وادیوں میں سکون تلاش کرتا پھرے گا۔ کبھی یہ دوسرے ڈرائیوروں سے حسد کرتے ہوئے تیز رفتاری کا مظاہرہ کرے گا تو کبھی جیتنے والوں پر الزام تراشی، بدگمانی اور بدتمیزی سے زیادتی کرنا چاہے گا۔

ارے تو اس کا مالک اسے کچھ نہیں کہتا؟ میں نے پوچھا

یہی تو مسئلہ ہے۔ جب مالک کا کنٹرول ڈرائیور پر کمزور پڑ جاتا ہے اسی بنا پر تو یہ ایسی حرکتیں کرتا ہے۔ پھر یہ ڈرائیور یا دل بہت چالاک ہوتا ہے۔ اسے علم ہے کہ اس کا مالک اگر مضبوط ہو گیا تو اس کی آزادی خطرے میں ہے۔ چنانچہ یہ اپنے مالک کو جھانسے میں لے آتا ہے۔ یہ بھی کھڑکیوں کے باہر جنسی مناظر میں مالک کو مشغول کر دیتا ہے۔ یہ اسے اچھے کھانے کھلا کھلا کر سست اور کاہل بنا دیتا ہے۔ یہ اسے لوگوں سے لڑوا کر اس کو الجھا دیتا ہے کہ مالک کو اس دل کی جانب نظر کرنے کی فرصت ہی نہیں ملتی۔

ارے تو یہ دل ایسا ظلم کیوں کرتا ہے؟ میں نے پوچھا

دیکھو بھئی، دل تو ایک ڈرائیور کی مانند ہے جس کا کام حکم ماننا ہے۔ یہ جو مالک ہے نا، یہ انسان کی روح ہے۔ یہ وہ روح ہے جو خدا نے انسان میں پھونکی۔ یہ روح خدا کی پھونک ہے۔ یہ ایک طرح کا ایک دم ہے جو خدا نے انسان پر کیا ہے تا کہ اپنی کچھ صفات ادنیٰ درجے میں انسان میں منتقل کر کے اسے جانوروں سے افضل بنائے۔ جب انسان ان خدائی رنگوں یعنی صفات کو استعمال نہیں کرتا اور اپنے اعضا پر کنٹرول ختم کر دیتا ہے تو اب یہ رحمانی صفات یا رنگ میلے ہونے لگتے اور آہستہ آہستہ گندگی میں تبدیل ہوتے جاتے ہیں۔ اب اس گندگی میں شیطان ڈیرے ڈالنا شروع کر دیتا ہے۔

جب یہ رنگ میلے ہو جاتے ہیں تو انسانی شخصیت شیطان کی آلہ کار بن جاتی ہے۔ اب دل پر نفس

لوامہ کی بجائے نفس امارہ کا قابو ہوتا ہے۔ اب یہ خدائی صفات کی حامل روح کی بجائے شیطانی ارواح کے قابو میں آ جاتا ہے۔ پھر یہ اسے جہاں چاہے لیے پھرتے ہیں۔

ارے تو اس دل، مائینڈ یا ڈرائیور پر قابو کیسے کیا جائے؟ اصل سوال تو یہی ہے؟ میں نے پھر پوچھا۔

اب اس کا جواب بہت آسان ہے۔ لیکن یہ جواب تم بتاؤ گے۔ اچھا یہ بتاؤ جب ڈرائیور کو ہم پہلی مرتبہ ملازم رکھتے ہیں تو کیا کرتے ہیں؟

اسے بتاتے ہیں کہ تمہارے کیا اوقات ہیں، کیا تنخواہ ہے، کب چھٹی اور کب نہیں۔ مالک کو کیا پسند ہے اور کیا نہیں وغیرہ۔ میں نے کہا۔

درست کہا تم نے۔ یہی معاملہ ہمیں اپنے دل کے ساتھ بھی کرنا ہے۔ اسے سختی سے بتادینا ہے کہ جائز کیا ہے ناجائز کیا ہے، ہماری اصل شخصیت کے لیے کیا درست ہے اور کیا نہیں، کب اٹھنا اور اور کب سونا ہے۔ اور سب سے بڑھ کر یہ بتادینا ہے کہ مالک کی مرضی چلے گی، ڈرائیور کی نہیں۔ اسے جدید اصطلاح میں ایجوکیشن کہتے ہیں۔ اچھا بتاؤ اس کے بعد کیا کرتے ہیں۔

اگر ڈرائیور کام صحیح نہ کرے تو اسے سزا دیتے ہیں۔ میں نے جواب دیا۔

ارے نہیں، اتنی جلدی سزا کا کوئی فائدہ نہیں۔ اسے کچھ ہفتے یا مہینے تربیت سے گذارو۔ اپنی مرضی سے آگاہ کرو، ہلکی پھلکی تنبیہ کرو۔ اسے جدید اصطلاح میں ٹریننگ کہتے ہیں۔

اس کے بعد اگر وہ نہ مانے تو سزا دینی ہے؟ میں نے کہا۔

ارے میاں تمہیں سزا کی بہت جلدی ہے لگتا ہے مستقبل میں مولوی بننے کا ارادہ ہے۔ اب دو مرحلے مکمل ہو گئے ہیں ایک ایجوکیشن اور دوسرا ٹریننگ۔ اب اگلا مرحلہ ہے ڈسپلن جس میں سزا ہی نہیں جزا کا نظام بھی ہے۔ ڈرائیور کو اچھی طرح سے بتادو کہ حکم کی خلاف ورزی کی سزا بھی ہوگی۔ جیسے جھوٹ بولنے پر اس کی تنخواہ کا دس فی صد حصہ صدقے میں دے دیا جائے گا، کسی فحش

سائٹ کو دیکھنے پر روزہ رکھنا ہوگا، کسی کو گالی دینے یا جھگڑا کرنے پرانا کو کچلنے کے لیے سرعام معافی مانگنی ہوگی وغیرہ۔

اچھا، زبردست۔ لیکن مزید جرمانے بھی تو ہو سکتے ہیں نا؟

ہاں، جرمانہ مالی، بدنی یا دونوں ہو سکتے ہیں۔ بس یہ خیال رہے کہ نہ تو جرمانہ اتنا ہلکا ہو کہ ڈرائیور کو کوئی فرق ہی نہ پڑے اور نہ اتنا بھاری کہ ڈرائیور کا کچومر نکل جائے اور وہ سرکش ہو کر بھاگ ہی جائے۔ اس کے علاوہ صرف سزا کا نظام ہی نہ رکھو۔ کبھی ڈرائیور کو آرام بھی دو، کبھی اس کی مرضی بھی چلنے دو لیکن اس طرح کہ تمہارے حکم پر ہی اسے محدود آزادی ملے۔ اسے اچھا کام کرنے پر شاباش دو۔ کبھی اسے کھانا کھلانے اچھی جگہ لے جاؤ، کبھی جائز حدود میں اسے زبردستی تفریح پر بھیجو، کبھی کچھ دنوں کے لیے اسے ڈسپلن سے محدود چھٹی بھی دو۔

ارے، یہ تو میں نے کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ ایسا بھی ہو سکتا ہے؟

بھئی یہی تو ایک مینٹر اور عام استاد میں فرق ہوتا ہے۔ تو اب ذرا جلدی سے بتاؤ کیا سمجھے؟

جی میرا دل ڈرائیور ہے جو میرا یعنی میری اصل باطنی شخصیت کا غلام ہے اور کار میرا جسم۔ اگر ڈرائیور کو ایجوکیشن، ٹریننگ اور ڈسپلن سے قابو نہ کیا جائے تو یہ میری ظاہری شخصیت کو بھی تباہ کر کے بیمار، لاغر، موٹا، بھدا، سست اور کاہل بنا دے گا اور میری باطنی شخصیت کو بھی ہائی جیک کر کے اسے شیطان کے ہاتھوں یرغمال بنا دے گا۔ چنانچہ مجھے سب سے پہلے اس کو قابو کرنا ہے۔ اسے بتانا ہے کہ کان، ناک، ہاتھ، منہ، زبان، چلنا پھرنا، کھانا پینا اور سونا جاگنا ہر کام میرے حکم ہی سے ہوگا۔ اور یہ نہ مانے تو سزا اور جرمانہ اور مانے تو جزا اور انعام۔

درست سمجھے۔ لیکن خالی سمجھنا کافی نہیں، عمل ضروری ہے ورنہ سمجھ لو ڈرائیور نے ایک اور جھانسا دے دیا کہ مجھے تو سب پتا ہے۔

(بھگوت گیتا اور امام غزالی کی احیاء العلوم سے ماخوذ)

احسان اللہ

دین ودنیا

اگر مسلمانوں کے زوال کے اسباب پر نگاہ ڈالی جائے تو ان میں سے ایک سبب یہ بھی ہے کہ ان کے اذہان میں یہ تاثر پیدا ہو گیا کہ دین اور دنیا آپس میں متضاد ہیں۔ اس نقطۂ نظر کے کسی بھی حامی سے دنیا اور دنیوی ترقی کے بارے میں بات کی جائے تو وہ یہی کہتا ہے کہ دنیا دکھ سکھ میں کٹ جائے گی بندے کو دین کی فکر کرنی چاہیے۔ اگر دیگر اقوام کی سائنسی ترقی کی مثال دی جائے تو جواب ملتا ہے کہ انھوں نے دنیوی ترقی کی ہے دین کے مقابل اس کی کوئی وقعت نہیں ہے۔ ظاہر ہے جب معاشرے میں مجموعی طور پر یہ دنیا بیزار تاثر پیدا ہو گا اور اسی کی تبلیغ و ترویج کی جائے گی تو یہ معاشرہ دنیا میں کیونکر اپنا کوئی کردار ادا کرنے یا حصہ ڈالنے کے لیے آمادہ ہو گا۔

دین و دنیا کا یہ تصور سرتا سر خود ساختہ ہے۔ اگر دنیا کو دین سے الگ کر دیا جائے تو دین کی حیثیت چند رسمی عبادات کے مجموعے سے بڑھ کر کچھ نہیں۔ حالانکہ معاملات کے باب میں دینی تعلیمات کے مقصد کو اگر ایک جملے میں بیان کیا جائے تو وہ یہ ہے کہ دنیوی معاملات کو اللہ اور رسول کی تعلیمات کے مطابق بطریق احسن انجام دیا جائے۔ دین و دنیا کا آپس میں وہی تعلق ہے جو جسم کا روح اور روح کا جسم سے ہے۔ لہٰذا یہ دین کا منشا تو کجا دین کی بنیادی تعلیمات کے ہی خلاف ہے کہ دنیا سے لاتعلقی برتی جائے اور خود کو صرف نماز روزہ یا وظائف اور مراقبات تک محدود رکھ کر اس خوش فہمی میں رہا جائے کہ ہم دین کے تقاضے پوری طرح نبھا رہے ہیں۔

اسلام میں دنیا کو دین کے متضاد کے طور پر پیش نہیں کیا گیا ہے۔ اس سلسلے میں اسلام جو تصور پیش کرتا ہے وہ دنیا کے مقابلے میں دین کا نہیں بلکہ دنیا کے مقابلے میں آخرت کا تصور ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان یہ نہ سمجھے کہ میری منزل مقصود یہی دنیا ہے۔ بلکہ وہ یہ سمجھے کہ یہ دنیا فانی

ہے اس کے بعد آخرت ہے جہاں انسان دنیا میں کیے گئے اپنے اعمال کا جوابدہ ہوگا۔ پس انسان کو چاہیے کہ وہ دنیوی امور انجام دیتے ہوئے آخرت کو اپنے پیش نظر رکھے۔ وہ ان تمام امور سے اجتناب کرے جن کے بارے میں اللہ اور اس کے رسول نے منع فرمایا ہے۔ جو لوگ آخرت کو بھلا کر دنیا ہی کو سب کچھ سمجھنے لگتے ہیں اور دنیا ہی کے لیے جیتے اور مرتے ہیں قرآن میں ان کی مذمت کی گئی ہے اور انھیں بتایا گیا ہے کہ یہ گھاٹے کا سودا ہے۔

دین و دنیا کے تضاد کی یہ سوچ نتیجے کے اعتبار سے بہت بھیانک ہے جبکہ اس کے مقابلے میں دنیا و آخرت کا تصور بہت حوصلہ افزا اور دنیا میں نیک اور پرہیزگار بن کر زندگی گزارنے کے لیے مہمیز کا کام کرتا ہے۔ جو لوگ دین و دنیا کو ایک دوسرے کے مخالف سمجھنے کے فلسفہ پر عمل پیرا ہیں وہ اس جانب مائل ہی نہیں ہوں گے کہ وہ مادی علوم سیکھیں جبکہ دنیا میں رہ کر آخرت کو پیش نظر رکھنے والے افراد ان علوم میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیں گے۔ وہ ان علوم میں مہارت حاصل کر کے انسانی فلاح و بہبود کے لیے کام کریں گے اور دنیوی امور کو بخوبی انجام دے کر اپنی آخرت سنواریں گے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو اس حقیقت سے بخوبی آگاہ ہیں کہ دنیا آخرت کی کھیتی ہے۔ جو فصل وہ یہاں بوئیں گے آخرت میں وہی کاٹیں گے۔

قانون بگڑے ہوئے افراد کے لیے ہوتا ہے
بگڑی ہوئی قوم کے لیے نہیں
بگڑی ہوئی قوم کی اصلاح
صرف دعوت و تربیت سے ہوتی ہے (ابویحییٰ)

ابو یحییٰ

مضامین قرآن (54)

اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق کی درست اساسات

ہم اخلاقی مطالبات کی بحث کے ضمن میں اللہ تعالیٰ کے حوالے سے عائد ہونے والے مطالبات کے ضمن میں عبادات کا جائزہ لے رہے تھے۔ عبادات کی بحث کے پورا ہونے کے بعد اب ہم ان مطالبات کی دوسری جہت پر کلام کریں گے جو اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق کی درست نوعیت کو بیان کرتی ہے۔

انسان ایک پیچیدہ مخلوق ہے۔ بظاہر وہ دیگر حیوانات کی طرح ایک مادی وجود اور حیوانی جبلتیں رکھتا ہے، مگر اس کو انسان بنانے والی چیز اس کا وہ نفسیاتی وجود ہے جو اخلاقی، روحانی اور عقلی شعور سے مل کر بنا ہے۔ یہ نفسیاتی وجود جس طرح انسانوں اور مادی دنیا کے ساتھ ایک ذہنی تعلق قائم کرتا ہے، اسی طرح یہ نفسیاتی وجود اپنے خالق و مالک اللہ رب العالمین کے ساتھ بھی ایک تعلق قائم کرتا ہے۔ قرآن مجید ہمیں بتاتا ہے کہ وہ کیا درست اساسات ہیں جن کی بنیاد پر انسان کے اس نفسیاتی وجود کو اپنے رب کے ساتھ متعلق ہونا چاہیے۔ ان میں سے اہم ترین اساسات درج ذیل ہیں۔

ایمان، یقین، اسلام اور قنوت

اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق کی پہلی اساس ایمان ہے۔ ایمان اپنے عقلی شعور اور فہم و بصیرت کو استعمال کرتے ہوئے کائنات کے رب کو دریافت کرنے کا نام ہے۔ یہ کائنات کی ناتمامی پر غور کر کے اس آنے والی دنیا کو مان لینے کا نام ہے جو اس دنیا کے بعد قائم ہوگی۔ یہ اپنے

تعصّبات، مفادات اور خواہشات کی بنا پر سچائی کی تکذیب کرنے کے بجائے اسے حق جان کر مان لینے کا نام ہے۔ سچائی اور حق کو مان لینا ہی ایمان کی روح اور اس کی اصل حقیقت ہے۔ سچائی کے انکار سے اس کے اقرار کا سفر ایمان کہلاتا ہے۔ یہ ذہن کی دنیا میں پیش آنے والا واقعہ ہے جو آخرکار خارج کی دنیا میں اپنا اظہار قولی اور عملی سطح پر کر کے دم لیتا ہے۔

یوں تو ہر سچائی کو مان لینا ایسے ہی ہوتا ہے۔ مگر خدا جس درجہ کی طاقتور اور بلند ہستی ہے، اس کی نعمتیں اور مہربانیاں جس درجے میں ہیں، وہ جس طرح لمحہ لمحہ اپنے بندوں سے متعلق رہتا ہے؛ اس کا لازمی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ایک بندہ مومن کا زندہ ایمان یقین و معرفت کے ایک عملی تجربے میں تبدیل ہوتا چلا جاتا ہے۔ یوں تو خدا غیب میں ہے اور اس پر ایمان کا بنیادی تقاضا یہی ہے کہ اسے بن دیکھے اور غیب میں رہ کر مانا جائے اور اسی بنا پر ایک نوعیت کا شک اور اضطراب محسوس ہونا فطری چیز ہے، مگر جب انسان ایمان کے تقاضوں کو نبھاتا ہے تو پھر اللہ تعالیٰ شک و اضطراب کے ہر کانٹے کو اس کے قلب سے نکالتے چلے جاتے ہیں۔ پھر یقین کی گھٹا قلبِ مومن پر برستی ہے اور معرفت کا وہ سبزہ زار وجود میں آتا ہے جو خود بندہ مومن کو بھی زندگی بخشتا ہے اور اس کے اردگرد موجود لوگوں کو بھی شاداب کر دیتا ہے۔

اس ایمان کی اصل اساس خدا کی وہ ہستی ہوتی ہے جس کی ہمہ گیر نگرانی، قرب، معیت اور علم کا یقین انسان کو خلوت و جلوت میں پاکیزہ اور تنگی و آسانی میں ثابت قدم رکھتا ہے۔ اس ایمان کی دوسری اساس خدا کے وعدوں کا وہ یقین ہوتا ہے جو اس نے آنے والی دنیا اور اس کی سزا و جزا کے حوالے سے کر رکھے ہوتے ہیں۔ تاہم یہ ایمان محض طفل تسلی کی نوعیت کی چیز نہیں ہوتی۔ یہ ایک زندہ مشاہدے کا لازمی نتیجہ ہے۔ وہ خدا جس نے دہکتے سورج، سرد و تاریک خلا اور چٹیل اجرام فلکی میں ہر سمت بکھری موت کے درمیان زندگی سے بھرپور ایک جنت کرہ ارض پر بنا دی

ہے، وہ کیوں آنے والی دنیا کو نہیں بنا سکتا ہے۔ وہ رب جس نے اس دنیا میں زندگی کی بقا اور تسلسل کا بھرپور انتظام کر رکھا ہے، اسے اگلی دنیا میں عیش جاودانی فراہم کرنے سے کیا چیز مانع ہوسکتی ہے۔ اسی طرح بندہ مومن کا یہ یقین ہوتا ہے کہ جس رب نے سورج کو دہکا رکھا ہے، اس کے لیے جہنم کی بھٹی کو دہکانا کیا مشکل ہے۔

اس ایمان کی تیسری اساس یہ یقین ہوتا ہے کہ خدائے دو جہاں آج بھی اس دنیا کا نظام اپنے فرشتوں کے ذریعے سے چلا رہا ہے۔ پھر جس طرح خدا کے فرشتے خدا کے حکم سے مادی دنیا کا نظم چلا رہے ہیں، اسی طرح اخلاقی دنیا میں ہدایت و رہنمائی کے لیے اللہ تعالیٰ نے اپنے نبیوں کو بھیجا ہے جو اس کی مرضی سے ہمیں آگاہ کرتے ہیں اور اپنے بعد اپنی تعلیم کو مقدس کتابوں اور ختم نبوت کے بعد قرآن مجید کی شکل میں چھوڑ جاتے ہیں۔

ایمان و یقین کی یہ دنیا انسان کو آمادہ کرتی ہے کہ وہ اپنے وجود کو اپنے رب کے حوالے کردے۔ اس کی اطاعت کی قبا اوڑھ لے اور اسلام کے بندھن سے خود کو باندھ کر اپنی رسی اپنے رب کے حوالے کردے۔ ہر سرکشی کو چھوڑ دے۔ ہر نافرمانی سے باز آجائے۔ ہر حکم کی تعمیل کرے۔ ہر امر کو بجالائے اور ہر منکر سے دور ہوجائے۔ چنانچہ ایمان کا سفر یقین کی وادی سے ہوتا ہوا اسلام کی مشکل گھاٹی کو پار کرنے کا حوصلہ پیدا کر لیتا ہے۔۔ چنانچہ ایمان لانا صرف ایک دفعہ مان لینے کا نام نہیں بلکہ زندگی کے ہر دوراہے پر انسان جب غیر اللہ کے مقابلے میں اللہ کی بات سنتا، باطل کے مقابلے میں حق کو اختیار کرتا اور سچائی کے انکار کے بجائے اس کے اعتراف کا راستہ اختیار کرتا ہے تو وہ اپنے ایمان کی تجدید کرتا، اپنے یقین کو محکم کرتا اور اپنے اسلام کا اظہار کرتا ہے۔

خدا اور اس کے وعدوں کو مان کر ان کا یقین کرنا، پھر دل کی دنیا آباد کرنے کے بعد اپنے

ظاہر کو خدا کے سامنے جھکا کر اس کے ہر حکم کو بجالا نا خدا کے ساتھ ہمارے تعلق کی وہ پہلی اساس ہے جس کا مطالبہ قرآن مجید شدت کے ساتھ کرتا ہے۔اس کے نتیجے میں پھر وہ باقی سارے مطالبات پورے ہوتے ہیں جن کا تقاضا کیا جاتا ہےاور وہ سارے رویے اختیار کر لیے جاتے ہیں جن کا حکم دیا جاتا ہے۔ایمان کا یہی وہ مقام ہے جسے قرآن مجید نے اس درخت سے تشبیہ دی جس کی جڑیں زمین میں اور شاخیں آسمان تک بلند ہوتی ہیں۔ یہ ایمان انفس وآفاق کی نشانیوں سے جلا پاتا اور آیات الٰہی کی تلاوت سے بڑھتا چلا جاتا ہے۔ یہ اللہ کی یاد سے اطمینان پاتا اور اس دنیا میں رہ کر جنت کی بشارت اور اچھے انجام کی خوشخبری پاتا ہے۔

قرآنی بیانات

’’جو بن دیکھے مان رہے ہیں اور نماز کا اہتمام کر رہے ہیں اور جو کچھ ہم نے انھیں دیا ہے اس میں سے (ہماری راہ میں) خرچ کر رہے ہیں‘‘،(البقرہ 3:2)

’’(یہ عقل کے اندھے ہیں، اِس لیے پیغمبر پر ایمان کے لیے نشانی مانگتے ہیں، ورنہ) حقیقت یہ ہے کہ زمین اور آسمانوں کے بنانے میں اور دن اور رات کے باری باری آنے میں اُن لوگوں کے لیے بہت سی نشانیاں ہیں جو بصیرت والے ہیں۔اُن کے لیے جو کھڑے اور بیٹھے اور اپنے پہلوؤں پر لیٹے ہوئے، ہر حال میں خدا کو یاد کرتے اور زمین اور آسمانوں کی خِلقت میں غور کرتے رہتے ہیں۔(اُن کی دعا یہ ہوتی ہے کہ) پروردگار، تو نے یہ سب بے مقصد نہیں بنایا ہے۔تو اِس سے پاک ہے کہ مقصد کے بغیر کوئی کام کرے۔سو ہم کو دوزخ کے عذاب سے بچا لے۔‘‘، (آل عمران 3 :191-190)

’’اور جو اسے بھی مان رہے ہیں جو تم پر نازل کیا گیا اور اسے بھی جو تم سے پہلے نازل کیا گیا اور آخرت پر فی الواقع یقین رکھتے ہیں۔‘‘،(البقرہ 4:2)

’’زمین اور آسمانوں کی ہر چیز نے اللہ کی تسبیح کی ہے اور وہ زبردست ہے، بڑی حکمت والا ہے۔زمین اور آسمانوں کی بادشاہی اُسی کی ہے۔وہی زندہ کرتا اور وہی مارتا ہے اور وہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔وہی اول بھی ہے اور آخر بھی، اور ظاہر بھی ہے اور باطن بھی، اور وہ ہر چیز کا

علم رکھنے والا ہے۔ وہی ہے جس نے زمین اور آسمانوں کو چھ دن میں پیدا کیا اور پھر (اُن کی تدبیر امور کے لیے) عرش پر جلوہ فرما ہوا۔ وہ جانتا ہے جو کچھ زمین میں جاتا ہے اور جو کچھ اُس سے نکلتا ہے، اور جو کچھ آسمان سے اترتا ہے اور جو کچھ اُس میں چڑھتا ہے، اور جہاں تم ہوتے ہو، وہ تمھارے ساتھ ہوتا ہے، اور جو کچھ تم کرتے ہو، اللہ اُسے دیکھتا ہے۔ زمین اور آسمانوں کی بادشاہی اُسی کی ہے اور تمام معاملات اللہ ہی کی طرف رجوع کیے جاتے ہیں۔ وہی رات کو دن میں اور دن کو رات میں داخل کرتا ہے اور وہ سینوں کے بھید تک جانتا ہے۔ (اِس لیے تم بھی اللہ کی تسبیح کرو اور) اللہ اور اُس کے رسول پر فی الواقع ایمان لاؤ اور جن چیزوں کا اللہ نے تمھیں امین بنایا ہے، اُن میں سے خرچ کرو۔ چنانچہ تم میں سے جو (اِس طرح) ایمان لائے اور اُنھوں نے (اللہ کی راہ میں) خرچ کیا ہے، اُن کے لیے بہت بڑا اجر ہے۔''، (الحدید 57 :7-1)

''(تم نہیں مانتے تو اِس کا نتیجہ بھی تمھیں ہی دیکھنا ہے)۔ ہمارے پیغمبر نے تو اُس چیز کو مان لیا جو اُس کے پروردگار کی طرف سے اُس پر نازل کی گئی ہے، اور اُس کے ماننے والوں نے بھی۔ یہ سب اللہ پر ایمان لائے، اور اُس کے فرشتوں اور اُس کی کتابوں اور اُس کے پیغمبروں پر ایمان لائے۔ (اِن کا اقرار ہے کہ) ہم اللہ کے پیغمبروں میں سے کسی کے درمیان کوئی فرق نہیں کرتے اور اِنھوں نے کہہ دیا ہے کہ ہم نے سنا اور سرِ اطاعت جھکا دیا۔ پروردگار، ہم تیری مغفرت چاہتے ہیں اور (جانتے ہیں کہ) ہمیں لوٹ کر تیرے ہی حضور میں پہنچنا ہے۔''، (البقرہ 285:2)

''(تاہم اُس کا تمام فضل و رحمت صرف اِسی گھر کے ساتھ خاص نہیں ہے)۔ حقیقت یہ ہے کہ جو مرد اور جو عورتیں مسلمان ہیں، مومن ہیں، بندگی کرنے والے ہیں، سچے ہیں، صبر کرنے والے ہیں، اللہ کے آگے جھک کر رہنے والے ہیں، خیرات کرنے والے ہیں، روزہ رکھنے والے ہیں، اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کرنے والے ہیں اور اللہ کو بہت زیادہ یاد کرنے والے ہیں، اللہ نے اُن کے لیے بھی مغفرت اور بڑا اجر تیار کر رکھا ہے۔''، (الاحزاب 35:33)

''(پھر یہی نہیں، اپنی نجات کے یہ مدعی اِس قدر پستی میں گر چکے ہیں کہ) اِنھوں نے کہا ہے کہ اللہ کی اولاد ہے۔ (لاریب)، وہ پاک ہے اِن باتوں سے، بلکہ زمین اور آسمانوں میں جو کچھ

ہے، اُسی کا ہے، سب اُس کا حکم مانتے ہیں۔''، (البقرہ116:2)

''(یاد رکھو)، اہل ایمان تو وہی ہیں کہ جب اللہ کا ذکر کیا جائے تو اُن کے دل دہل جاتے ہیں اور جب اُس کی آیتیں اُنھیں سنائی جاتی ہیں تو اُن کا ایمان بڑھا دیتی ہیں اور وہ اپنے رب پر بھروسا رکھتے ہیں۔''، (الانفال2:8)

''(یہ اِس لیے کہ اُن کے علم و عمل کی بنیاد ایک کلمۂ طیبہ ہے)۔ کیا تم نے دیکھا نہیں کہ اللہ نے کلمۂ طیبہ کی مثال کس طرح بیان فرمائی ہے؟ وہ ایک شجرۂ طیبہ کے مانند ہے جس کی جڑیں زمین میں اتری ہوئی اور جس کی شاخیں فضا میں پھیلی ہوئی ہیں۔ وہ اپنے پروردگار کے اذن سے اپنا پھل ہر فصل میں دیتا رہتا ہے۔ (یہ کلمۂ طیبہ کی مثال ہے) اور اللہ لوگوں کے لیے تمثیلیں بیان فرماتا ہے تاکہ وہ یاددہانی حاصل کریں۔'''، (ابراہیم14 :24-25)

''جو ایمان لائے اور جن کے دل اللہ کی اِس یاددہانی سے مطمئن ہوتے ہیں۔ سنو، اللہ کی اِس یاددہانی ہی سے دلوں کو اطمینان حاصل ہوتا ہے۔ جو ایمان لائے اور جنھوں نے اچھے عمل کیے، اُن کے لیے خوش خبری ہے اور اچھا ٹھکانا ہے۔''، (الرعد13 :28-29)

مبشر نذیر

ترکی کا سفرنامہ (58)

تصوف کی عالمگیر تحریک

انسانیت کی تاریخ میں تصوف یا صوفی ازم ایک عالمگیر تحریک رہی ہے۔ایک طویل عرصے سے اناطولیہ کا علاقہ تصوف کا عالمی مرکز رہا ہے۔مناسب ہوگا کہ اس کی کچھ تفصیل یہاں پیش کر دی جائے۔

انسانوں میں دو رجحان بہت عام رہے ہیں۔ایک رجحان دنیا پرستی کا ہے جس میں انسان مال و دولت، شہرت، اور لذت حاصل کرنے کے لئے اپنے دین و ایمان کو بھی داؤ پر لگا دیتا ہے۔ اس کے بالکل برعکس دوسرا رجحان دنیا سے گریز کا ہے جس میں انسان دنیا کو چھوڑ کر جنگلوں میں نکل جاتا ہے۔قدیم دور سے یہ دونوں رجحان انسانوں میں موجود رہے ہیں۔ ایسے خواتین و حضرات جن میں دنیا سے گریز کا رجحان قوی تھا، انہوں نے ضروریات زندگی سے منہ موڑ کر جنگلوں اور خانقاہوں کی راہ لی اور اپنا پورا وقت اپنے رب کی تلاش میں صرف کرنا شروع کر دیا۔ یہی لوگ ''راہب'' کہلائے۔

دنیا کے جھمیلوں سے فراغت کی وجہ سے ان خواتین و حضرات کے پاس وقت کی کمی نہ تھی۔ یہی وجہ ہے کہ خدا کے بارے میں سوچتے سوچتے انہوں نے بہت سے فلسفے وضع کر لیے۔یونانی فلسفے سے تصوف میں ''وحدت الوجود (Pantheism)'' کا فلسفہ داخل ہوا۔اس کے ساتھ ساتھ انہوں نے عبادت کے نت نئے طریقے ایجاد کیے۔تصوف کی دنیا کا بنیادی اصول یہ طے پایا کہ اس راہ میں چلنے والا ہر شخص اپنی شخصیت کو مٹا کر کسی مرشد کے ہاتھ میں اپنا ہاتھ دے اور اس کا غلام بن کر خود کو اس کے مکمل سپرد کر دے۔

اہل تصوف نے اپنا وقت نفسی علوم (Parapsychology) جیسے ٹیلی پیتھی، ہپناٹزم اور اس قبیل کے دیگر علوم میں بھی صرف کرنا شروع کر دیا۔ اس کے نتیجے میں انہیں محیر العقول کرامتیں دکھانے کی صلاحیت نصیب ہوگئی۔ چونکہ تصوف اور مذہب کا موضوع ایک ہی ہے، اس وجہ سے اس بات کا غالب امکان تھا کہ تصوف کا ٹکراؤ مروجہ مذاہب کے ساتھ ہو جائے۔ ایسا ہی ہوتا مگر اہل تصوف کی اکثریت نے مذہب سے ٹکراؤ کے بجائے ایڈجسٹمنٹ کی پالیسی اختیار کی۔ انہوں نے تصوف کے بنیادی نظریات اور اعمال کو قائم رکھتے ہوئے ہر مذہب کے اندر جگہ بنا لی۔ قدیم مذاہب میں بدھ مت، ہندومت اور ایران کا زرتشتی مذہب اس کی مثال ہیں۔ خاص طور پر ہندوؤں کے جوگی برصغیر کے معاشرے میں آج تک غیر معمولی مقام کے حامل رہے ہیں۔

یہودیوں کے ساتھ بھی یہی معاملہ ہوا۔ ان کے ہاں "کبّالہ" کا مکتب فکر پیدا ہوا۔ یہود کے راہبوں نے نفسی علوم میں غیر معمولی مہارت حاصل کی اور اس کے ذریعے لوگوں کے کام کرنے لگے۔ انہوں نے ''زوہار'' کے نام سے تورات کی ایک صوفیانہ تفسیر لکھی۔ ان کی کامیابیوں کے پیش نظر بہت سے دنیا پرست بھی ان کے ساتھ شامل ہو گئے۔ ان جعلی صوفیوں کا مقصد لوگوں کو اپنا مرید بنا کر انہیں لوٹنا تھا۔ انجیل سے معلوم ہوتا ہے کہ سیدنا عیسی علیہ الصلوٰۃ والسلام کے زمانے میں ان صوفیاء کا بہت غلبہ تھا۔ آپ کا یہ ارشاد بہت مشہور ہے:

اے شریعت کے عالمو اور فریسیو! اے ریا کارو! تم پر افسوس، کیونکہ تم کسی کو اپنا مرید بنانے کے لئے تو تری اور خشکی کا سفر کر لیتے ہو اور جب بنا لیتے ہو تو اسے اپنے سے دوگنا جہنمی بنا دیتے ہو۔ (یعنی اپنے سے دوگنا بے عمل بنا دیتے ہو۔) (متی 15:23)

یہودیت کے بعد عیسائیت کا دور آیا۔ عیسائیوں نے رہبانیت یا تصوف کو غیر معمولی درجہ دیا۔ انہوں نے رہبانیت کو باقاعدہ فن بنا کر پوری عیسائی دنیا میں پھیلا دیا۔ رومی مملکت کے طول

وعرض میں بڑی بڑی خانقاہیں قائم ہوئیں جن میں ہزاروں کی تعداد میں لوگ اپنے نفس کو کچلنے کے لئے خود کو اذیت دینے میں مصروف رہا کرتے تھے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعض صحابہ جیسے سیدنا عثمان بن مظعون، ابوذر غفاری اور ابو درداء رضی اللہ عنہم میں دنیا سے گریز کا رجحان پایا جاتا تھا۔ ان کی اصلاح کرتے ہوئے آپ نے شدت سے رہبانیت کی نفی فرمائی۔ یہ واقعات چند مشہور احادیث میں اس طرح بیان ہوئے ہیں:

سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: تین آدمیوں کا ایک گروہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ازواج کی خدمت میں حاضر ہوا۔ وہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عبادت کے بارے میں سوال کر رہے تھے۔ جب انہوں نے آپ کی عبادت کی تفصیلات بیان کیں تو وہ بولے: ''کہاں ہم اور کہاں نبی صلی اللہ علیہ وسلم؟ اللہ نے آپ کی اگلی اور پچھلی خطائیں معاف کر دی ہیں۔'' ان میں سے ایک نے کہا: ''جہاں تک میرا تعلق ہے، میں تو ہمیشہ پوری رات نماز پڑھا کروں گا۔'' دوسرے نے کہا: ''میں ہمیشہ روزہ رکھوں گا اور کبھی افطار نہ کروں گا۔'' تیسرے نے کہا: ''میں خواتین سے دور رہوں گا اور کبھی شادی نہیں کروں گا۔''

جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تشریف لائے تو آپ نے فرمایا: ''کیا تم لوگوں نے اس اس طرح کہا ہے؟ اللہ کی قسم! میں تم سے زیادہ اللہ سے ڈرتا ہوں اور اس کا خوف رکھتا ہوں مگر روزہ بھی رکھتا ہوں اور افطار بھی کرتا ہوں۔ میں نماز بھی پڑھتا ہوں اور سوتا بھی ہوں اور شادی بھی کرتا ہوں۔ جس نے میری سنت سے اعراض کیا، اس کا مجھ سے کوئی تعلق نہیں۔'' (بخاری کتاب النکاح)

سیدنا انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرمایا کرتے تھے:

تم (دین کے معاملے میں) اپنی ذات پر تشدد نہ کیا کرو ورنہ تم پر تشدد کیا جائے گا۔ ایک قوم نے شدت سے کام لیا تو اللہ نے ان پر شدت کر دی۔ یہ انہی کی باقیات ہیں جو تم گرجوں اور خانقاہوں میں دیکھتے ہو۔ (پھر آپ نے یہ آیت تلاوت فرمائی) ''رہبانیت تو انہوں نے خود ایجاد کر لی تھی۔ ہم نے اسے ان پر فرض نہ کیا تھا۔'' (سنن ابوداؤد، کتاب الادب)

حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ان واضح ارشادات کے باعث مسلمانوں کی ابتدائی نسلوں میں صوفی ازم یا رہبانیت کا مزاج پروان نہ چڑھ سکا۔ بعد کی صدیوں میں مسلم معاشروں میں کچھ ایسی تبدیلیاں رونما ہوئیں جن کی بدولت یہاں تصوف کو غیر معمولی فروغ حاصل ہوا۔ ان تبدیلیوں کی تفصیل یہاں ہم ریحان احمد یوسفی صاحب کے الفاظ میں بیان کر رہے ہیں:

''خلافتِ راشدہ کے زمانے میں سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کے عہد کے ابتدائی حصے تک مسلمان ان دونوں کے ساتھ مستقل حالت جنگ میں رہے۔ آخر کار مسلمانوں نے سلطنتِ فارس کا خاتمہ کر دیا اور روم کے تمام ایشیائی مقبوضات پر قبضہ کر کے اس کی کمر توڑ دی۔ اس عمل کے نتیجے میں مشرکانہ تہذیب مغلوب ہوگئی اور ان تمام علاقوں کے لوگوں نے اسلام قبول کر لیا۔ یوں صحابہ کرام کا مشن مکمل ہو گیا۔ تاہم اس دوران میں مسلم معاشرے میں ایک بنیادی تبدیلی یہ آئی کہ وقت گزرنے کے ساتھ رسول اللہ کے فیض یافتہ صحابہ کی تعداد کم ہوتی گئی اور مال و دولت کی بے پناہ کثرت ہوگئی۔ قیصر و کسریٰ کے خزانے اور شام و عراق کی سونا اگلتی زمینیں مسلمانوں کے قبضے میں آ گئیں، لیکن غیر تربیت یافتہ نومسلموں کے زیر اثر مسلمانوں کی وہ اخلاقی روایت متاثر ہونے لگی جو نورِ نبوت کے فیضان سے مدینہ کے معاشرے میں روشن تھی۔

سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کے عہد میں مسلمانوں کے باہمی خلفشار کا آغاز ہوا اور پھر ان کی مظلومانہ شہادت کے ساتھ ہی مسلمانوں میں باہمی جنگ و جدال کا آغاز ہو گیا۔ سیدنا علی رضی

اللہ عنہ کا پورا دور اسی جنگ و جدال اور انتشار میں گزرا۔ اس کے بعد بنو امیہ کا تقریباً ایک صدی پر محیط عرصہ مستقل بغاوتوں، جنگوں اور خانہ جنگیوں سے عبارت ہے۔ اس عرصہ میں سیدنا حسین رضی اللہ عنہ اور حضرت عبداللہ ابن زبیر رضی اللہ عنہما کی شہادت اور مکہ اور مدینہ کے مقدس شہروں کی بے حرمتی جیسے المناک واقعات پیش آئے۔ اس کے علاوہ بھی باہمی جنگوں کے دیگر ان گنت واقعات میں صالحین کی بڑی تعداد اس دنیا سے رخصت ہوگئی۔

132ھ میں بنو امیہ کا خاتمہ علویوں (حضرت علی کی اولاد و وابستگان) اور عباسیوں کی ایک بڑی بغاوت کے نتیجے میں ہوا۔ تاہم امن ابھی لوگوں کے نصیب میں نہ تھا۔ پہلے عباسیوں نے بنو امیہ پر ظلم و ستم کے بدترین پہاڑ توڑے۔ اس کے بعد علویوں اور عباسیوں کا باہمی جھگڑا کھڑا ہوگیا۔ علویوں کی پے درپے بغاوتوں کے نتیجے میں خلیفہ منصور کے زمانے تک یعنی اگلے بیس برس مسلم معاشرہ خانہ جنگی کی ایک مستقل کیفیت میں رہا۔''

[جاری ہے]

پروین سلطانہ حناؔ

غزل

شام سر پر ہے اپنے گھر جاؤں
ایک روشن لکیر کر جاؤں

اُس کو بچھڑے ہوئے زمانہ ہوا
سامنے آئے اور میں مر جاؤں

اِس چمن میں رہوں صبا بن کر
خوشبوؤں کی طرح بکھر جاؤں

میں چلوں تو صبا کا عکس بنوں
چھاؤں بن جاؤں جب ٹھہر جاؤں

لب و لہجہ رکھوں محبت کا
زخم دل کے گلاب کر جاؤں

ظلمتوں کا جہاں بسیرا ہو
روشنی کی طرح ٹھہر جاؤں

اک سہیلی مری حناؔ بھی ہے
اُس کے خوابوں میں رنگ بھر جاؤں

ابو یحییٰ کے ناول

جو آپ کی سوچ، زندگی اور عمل کا محور بدل دیں گے

جب زندگی شروع ہو گی

ایک تحریر جو ہدایت کی عالمی تحریک بن چکی ہے

قسم اس وقت کی

ایک منکرِ خدا لڑکی کی داستان سفر، جو سچ کی تلاش میں نکلی تھی

آخری جنگ

شیطان کے خلاف انسان کا اعلان جنگ

خدا بول رہا ہے

عظمتِ قرآن کا بیان ایک دلچسپ داستان کی شکل میں

Please visit our websites to read the articles and books of Abu Yahya online for free.

www.inzaar.org

www.inzaar.pk (Urdu Website)

Join us on twitter @AbuYahya_inzaar

Join us on Facebook

Abu Yahya's Official Page: facebook.com/abuyahya.inzaar

Inzaar Official Page: facebook.com/inzaartheorg

Join us on YouTube youtube.com/inzaar-global

WhatsApp Broadcast list: Please contact +92-334-1211120 from WhatsApp (Daily Msg Service-Broadcast Lists – No Groups)

To get books and Inzaar's monthly magazines at home anywhere in Pakistan, contact 0332-3051201 or 0345-8206011

To participate in online courses, visit ww.inzaar.org/online-courses/

To get any other information, email to **info@inzaar.org** and info@inzaar.pk

Our material in audio form is available on USB/CD

فون: 0332-3051201, 0345-8206011
ای میل: globalinzaar@gmail.com
web: www.inzaar.org

ایک دعوتی و اصلاحی رسالہ ہے۔ اس کا مقصد لوگوں میں ایمان و اخلاق کی دعوت کو عام کرنا ہے۔ اس دعوت کو دوسروں تک پھیلانے میں ہمارا ساتھ دیجیے۔ یہ رسالہ خود بھی پڑھیے اور دوسروں کو بھی پڑھوایئے۔ اپنے کسی عزیز، دوست، ساتھی یا رشتہ دار کے نام سال بھر رسالہ جاری کروانے کیلئے:

کراچی کے لیے 500، بیرون کراچی کے لیے 400 روپے کا منی آرڈر ہمارے پتے پر ارسال کیجئے...... یا
ایک پے آرڈر / بینک ڈرافٹ بنام ''ماہنامہ انذار'' بینک الفلاح لمیٹڈ (صدر برانچ)
اکاؤنٹ نمبر 0171-1003-729378 کے نام بھجوایئے
رسالہ آپ کو گھر بیٹھے ملتا رہے گا

اگر آپ ہماری دعوت سے متفق ہیں تو ہمارے ساتھ تعاون کر سکتے ہیں، اس طرح کہ آپ:

1) ہمارے لیے دعا کیجیے کہ اللہ تعالیٰ ہماری رہنمائی فرمائے
2) 'ماہنامہ انذار' کو پڑھیے اور دوسروں کو پڑھوایئے
3) تعمیرِ ملت کے اس کام کو دوسروں تک پہنچانے کے لیے رسالے کی ایجنسی لیجیے

ایجنسی لینے کا طریقہ کار:

ایجنسی کے لیے ہر ماہ کم از کم پانچ رسالے لینا ضروری ہے
ایجنسی کا ڈسکاؤنٹ 20 فیصد ہے
ایجنسی لینے کے لیے اوپر دیئے گئے پتے پر رابطہ کیا جا سکتا ہے

Monthly
INZAAR
NOV 2018
Vol. 06, No. 11
Regd. No. MC-1380
Publisher: Rehan Ahmed Printers: The Sami Sons Printers,
25-Ibrahim Mansion, Mill Street, Pakistan Chowk, Karachi

ابویحییٰ کی دیگر کتابیں

"ملاقات"

اہم علمی، اصلاحی اجتماعی معاملات پر ابویحییٰ کی ایک نئی فکرانگیز کتاب
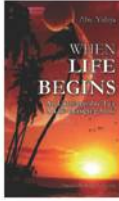
"کھول آنکھ زمیں دیکھ"

مغرب اور مشرق کے سات اہم ممالک کا سفرنامہ

"جب زندگی شروع ہوگی"

ایک تحریر جو ہدایت کی عالمی تحریک بن چکی ہے

"بس یہی دل"

دل کو چھو لینے والے مضامین ذہن کو روشن کر دینے والی تحریریں

"قسم اُس وقت کی"

ابویحییٰ کی شہرہ آفاق کتاب "جب زندگی شروع ہوگی" کا دوسرا حصہ

"تیسری روشنی"

نفرت اور تعصب کے اندھیروں کے خلاف روشنی کا جہاد

"When Life Begins"

English Translation of Abu Yahya Famous book

Jab ZindagiShuruHo Gee

"حدیثِ دل"

موثر انداز میں لکھے گئے علمی، فکری اور تذکیری مضامین کا مجموعہ

"قرآن کا مطلوب انسان"

قرآن کے الفاظ اور احادیث کی روشنی میں جانیے اللہ ہم سے کیا چاہتے ہیں